مظاہر الآمال

(اعمال واحوال کے ثمرات)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	کسی چیز کا پرانا ہونا بے وقعتی کی دلیل نہیں	۸
۳	ذِکر دنیا کی حقیقت	۸
۴	آج کل دنیا طلبی کا حال	۱۰
۵	دنیائے مذموم کی حقیقت	۱۰
۶	دنیائے محمودہ کی طلب فرض ہے	۱۱
۷	دنیا کی محبت ممنوع ہے	۱۲
۸	اشکال کا جواب	۱۲
۹	مذمتِ دنیا کی وجوہ	۱۳
۱۰	(اعوذ باللہ) پڑھنے کا حکم اور فائدہ	۱۴
۱۱	خوفِ خدا سے رونے کا فائدہ	۱۵

۱۲	تسبیح ہاتھ میں لینے کا فائدہ	۱۶
۱۳	دنیا کی حقیقت	۱۶
۱۴	مضامین میں تکرار کی مثال اور فائدہ	۱۷
۱۵	دِیدارِ حق کا شوق و بے قراری	۱۸
۱۶	عارفین کا حال	۲۰
۱۷	اصلاح کے لئے سختی و نرمی دونوں کی ضرورت ہے	۲۲
۱۸	مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال	۲۳
۱۹	جنت میں عارفین کی دو قسمیں	۲۳
۲۰	حسنِ الٰہی کی حقیقت	۲۴
۲۱	بعض سالکین کی غلطی	۲۵
۲۲	نورِ الٰہی کا اظہار آخرت میں ہوگا	۲۵
۲۳	دنیا میں دیدارِ خداوندی کا طریقہ	۲۶
۲۴	لفظی بالقرآن کی تحقیق	۲۸
۲۵	قرآن کی خوبی	۲۸
۲۶	تکرارِ مضمون کی وجہ	۲۹
۲۷	انتخاب مضمون کی وجہ	۳۰

۲۸	مال واولاد کی حقیقت	۳۰
۲۹	لڑکوں کو ذِکر اور لڑکیوں کے عدمِ ذکر میں نکتہ	۳۲
۳۰	پردہ کے وجوب پر عقلی دلیل	۳۲
۳۱	پردہ تعلیم میں رکاوٹ نہیں	۳۳
۳۲	عورتوں کو سیر وسیاحت کا نقصان	۳۳
۳۳	تعلق مع اللہ کا فائدہ	۳۵
۳۴	اہل اللہ کی سلطنت سے بے رغبتی	۳۵
۳۵	صحابہ رضی اللہ عنہم کی حکومت کا حال	۳۷
۳۶	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حال	۳۸
۳۷	نکتہ	۳۹
۳۸	اعمالِ صالحہ کے ذِکر اور اعمالِ سیئہ کے عدم ذکر کی وجہ	۳۹
۳۹	شبہ کا جواب	۴۱
۴۰	دوسرے شبہ کا جواب	۴۲
۴۱	اعمالِ صالحہ کی قدر ومنزلت	۴۳
۴۲	بے جا تواضع سے احتراز	۴۴
۴۳	کیفیات واحوال کی حقیقت	۴۵

۴۴	احمقانہ حساب	۴۶
۴۵	مال کے ضائع ہونے پر رنج نہ کرو	۴۷
۴۶	سالکین کو نصیحت	۴۸
۴۷	تفسیر آیت	۴۹
۴۸	مسلمانوں کے لئے خوشخبری	۵۰
۴۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت حضرت علیہ السلام کی صحابہ و تسلی	۵۱
۵۰	رجاء (امید) کا فائدہ	۵۱
۵۱	اعمالِ صالحہ کا نقد فائدہ	۵۲
۵۲	بُرے اعمال کا فوری نقصان	۵۳
۵۳	نماز کی لذت	۵۳
۵۴	ہر نقد ادھار سے بہتر نہیں	۵۴
۵۵	اعمالِ صالحہ کا نقد فائدہ راہِ ہدایت پر ہوتا ہے	۵۴
۵۶	باقیات صالحات کی دو قسمیں	۵۶
۵۷	اہلِ مدارس کو نصیحت	۵۷
۵۸	عوام کی نصیحت	۵۸
۵۹	ایک بے وقوف کی حکایت سے استدلال	۵۸

وعظ

مظاہر الآمال

(اعمال واحوال کے ثمرات)

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے یہ وعظ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سالانہ جلسہ میں بروز اتوار یکم جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ کو منبر پر کھڑے ہوکر ڈھائی گھنٹے تک ارشاد فرمایا:

مضمون یہ تھا کہ دنیا میں انہماک سے بچا جائے اور آخرت کی فکر کی جائے ایسے اعمال اختیار کئے جائیں جو آخرت میں مفید ہوں اور ان اعمال سے احتراز کیا جائے جو انہماک فی الدنیا کا سبب بنیں۔

سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔

محدث کبیر علامہ ظفر احمد عثمانی قدس سرہ نے اس وعظ کو قلم بند کیا اور اس کی تفصیلی تسوید ۲/ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ کو شروع فرما کر ۷/ جمادی الثانی ۱۳۳۵ کو مکمل فرمائی۔

یہ وعظ ہر طبقہ کے لئے انتہائی مفید ہے۔

خلیل احمد تھانوی

۴/محرم الحرام ۱۴۳۲ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتو کل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴾[1]

تمہید

ہر چند کہ یہ مضمون بارہا سنا ہوگا اس آیت کے ظاہری مضمون کو سننے والوں نے سمجھ لیا ہوگا اور اسی کے ساتھ یہ بھی دل میں کہتے ہوں گے کہ پرانا مضمون انہاک دنیا سے منع کرنے کا ہے (۲) اور شاید اس لئے اس کی وقعت بھی دل سے نکل گئی ہوگی کیونکہ آج کل نئے مضمون کی زیادہ وقعت ہوتی ہے (۳) جو پہلے سے نہ سنا ہو۔

---

(۱) ''مال اور اولاد حیاتِ دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہے'' سورۂ کہف:۴۶ (۲) دنیا میں زیادہ کھپنے کی ممانعت کا بیان ہوگا (۲) قدر و منزلت ہوتی ہے۔

کسی چیز کا پرانا ہونا بے وقعتی کی دلیل نہیں

مگر میں کہتا ہوں کہ کسی چیز کا پرانا ہونا اس کی بے وقعتی کا سبب نہیں ہوسکتا اور اس کے لئے میں اسلام کو دلیل میں پیش کرتا ہوں کہ وہ بھی بہت پرانا ہے تیرہ سو برس سے زیادہ کا ہوگیا ہے اگر کوئی چیز پرانی ہوکر بے وقعت ہوجاتی ہے تو کیا نعوذ باللہ (ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں) اسلام کو بھی بے وقعت کہا جائے گا اگر کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہو اور کسی سچے مسلمان سے تو مجھے اس کی امید نہیں ہاں کوئی نام کا مسلمان اس کے لئے تیار ہو تو میں اُس سے کہوں گا کہ یہ حیلے حوالے کیوں کیئے جاتے ہیں صاف یہی کہہ دو نا کہ ہم خدا ہی کو چھوڑتے ہیں کہ وہ بھی بہت پرانے ہیں (اَلْاَوَّلُ الَّذِیْ لَیْسَ قَبْلَہٗ شَیْئٌ) وہ تو ایسے قدیم ہیں کہ اُن سے پہلے کوئی بھی نہیں گو اس وقت کانوں سے آواز سنائی نہیں دیتی مگر سب کے دل ہی دل میں سے یہ آواز آرہی ہے کہ اسلام کو اور خدا تعالیٰ کو ہم نہیں چھوڑ سکتے جب خدا تعالیٰ کو نہیں چھوڑا جاتا تو ان کے کلام کو کیونکر چھوڑا جاسکتا ہے، اس لئے میں تلبیس (۱) نہیں کرتا کہ کسی نئے مضمون سے شروع کر کے مقصود کی طرف رجوع کروں براہ راست پرانا ہی مضمون شروع کر کے اپنے مقصود کو صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہیچ ہے لاشئی ہے جیسے ستارے آفتاب کے سامنے کچھ نہیں اور کانسٹیبل وائسرائے کے سامنے کچھ نہیں۔ واللہ (خدا کی قسم)

ذکرِ دنیا کی حقیقت

دُنیا کے لئے یہی فخر کافی ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ ذکر ہوتی ہے ۔

(۱) مضامین میں خلط ملط نہیں کرتا۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مراد　　بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

''مجھ کو آپ سے اتنی ہی نسبت کافی ہے جس طرح بلبل کو یہی کافی ہے کہ گل کا قافیہ ہو جائے''

کانسٹیبل کے لئے یہی وقعت کافی ہے کہ وہ ملازمان سرکاری میں وائسرائے کے ساتھ ذکر ہوتا ہے (۱) کیا اہلِ دنیا یہ چاہتے ہیں کہ ہم دین کا نام نہ لیں اور دنیا ہی کا ذکر رات دن کیا کریں یہ تو ہم سے نہیں ہوسکتا ہاں اُن کی خاطر سے کبھی کبھی دنیا کا ذکر بھی کر دیتے ہیں وہ بھی کون سی دنیا؟ دنیائے محمودہ، جو معین آخرت ہو (۲) کیونکہ دنیائے مذمومہ نہ انفراداً قابلِ ذکر ہے نہ انضماماً نہ مدحاً نہ ذماً گو مذموم ہے (۳)۔ مگر بلاضرورت ذم کے ساتھ بھی قابل ذکر نہیں (۴) اسی وجہ سے حضرت رابعہ بصریہ علیہا رحمۃ اللہ نے چند زاہدوں کو تنبیہ فرمائی تھی جو اُن کے سامنے دنیا کی مذمت کر رہے تھے: (قُوْمُوْا عَنِّیْ فَاِنَّکُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا) ''میرے پاس سے اُٹھ جاؤ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو'' حالانکہ وہ دنیا کے مذموم (۵) ہونے کا ذکر کر رہے تھے مگر بلاضرورت کر رہے تھے اور اِس وقت کے مسلمانوں کو اس مردار سے ایسا تعلق ہے کہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو خدا سے کرنا چاہیئے تھا یعنی خدائے تعالیٰ کے طلب کی یہ شان ہونی چاہیئے تھی ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست　　ہر چہ بروے میرسی بروے مالیست

''اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو بلکہ آگے ترقی کرو''

---

(۱) سپاہی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وائسرائے کے ساتھ اس کا ذکر بھی سرکاری ملازمین میں ہوتا ہے (۲) پسندیدہ دنیا جو آخرت کے حصول میں مددگار ہو (۳) اور ناپسندیدہ دنیا کا ذکر نہ تو تنہا مناسب اور نہ کسی کے ساتھ ملا کر نہ تعریف کے طور پر، اگرچہ وہ بُری ہے کیونکہ وہ خدا سے دور کرتی ہے (۴) مگر بلاضرورت اس کا ذکر برائی کے طور پر مناسب نہیں (۵) دنیا کے بُرا ہونے کا۔

آج کل دنیا طلبی کا حال

مگر آج کل طلبِ دنیا کے ساتھ بعینہٖ یہ معاملہ ہو رہا ہے کہ اس کی کسی حد پر بس نہیں کرتے (لَا یَنْتَھٰی اِرُبٌ الا اِلٰی اِرُبٍ) ایک کام کو ختم کرتے ہیں دوسرے میں لگ جاتے ہیں ہزار روپے جمع ہو گئے تو دو ہزار کی فکر ہے کسی کے پاس ایک لاکھ جمع ہیں تو دو لاکھ کی تمنا کر رہا ہے بس اس مردار کو یوں سمجھ لیا ہے کہ ؎

بحریست بحرِ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست آں جا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

’’دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ اس جگہ سوائے جان سونپے کے کوئی چارہ نہیں ہے‘‘۔

چنانچہ آج اس پر فخر ہوتا ہے کہ ہم تو دنیا میں کھپ گئے ہیں ہم کو سوائے کمانے کے اور کوئی دھندا نہیں۔ ایک کہتا ہے کہ مجھ کو اتنا نفع ہوا دوسرا کہتا ہے کہ میرے پاس اتنا جمع ہے تیسرا کہتا ہے کہ میرے پاس اتنی دوکانیں ہیں اور ہر ایک کی اتنی آمدنی ہے ان باتوں کو فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

دنیائے مذموم کی حقیقت

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو بھنگی آپس میں فخر کریں ایک کہے کہ میں نے اتنے گوہ کے ٹوکرے کمائے (۱) دوسرا کہے میں نے تجھ سے زیادہ کمائے۔ یہ ہے دنیائے مذموم جس نے خدا تعالیٰ سے غافل کر رکھا ہے۔

(۱) میں نے صبح سے شام تک اتنے ٹوکرے گوبر اٹھایا۔

دنیائے محمودہ کی طلب فرض ہے

باقی دنیائے محمودہ کو منع نہیں کیا جاتا جناب رسول اللہ ﷺ جو کہ ’’ اَعْقَلُ النَّاسِ ‘‘ (سب لوگوں سے زیادہ عقلمند) ہیں اورصرف ہمارے ہی نزدیک نہیں ہم تو غلامانِ غلام ہیں ہم تو آپ کو ’’اَعْقَلُ النَّاسِ اَفْضَلُ النَّاسِ اَکْمَلُ النَّاسِ ‘‘(سب لوگوں سے زیادہ عقلمند سب لوگوں سے زیادہ بزرگ تر سب لوگوں سے زیادہ کامل) سب کچھ مانتے ہی ہیں لیکن آپ تو ایسے عاقل ہیں کہ کفار بھی آپ کا لوہا مان گئے بلکہ وہ حضور ﷺ کو ہم سے بھی زیادہ عاقل مانتے ہیں کیونکہ ہم تو حضور ﷺ کو امداد الٰہی کی وجہ سے مقاصد میں کامیاب مانتے ہیں اور کفار یہ دیکھ کر نور اسلام روز بروز بڑھتا جاتا ہے اس کو حضور ﷺ کی عقل وفہم کا ثمرہ سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے رسول ﷺ اس قدر عاقل تھے کہ ایسی تدبیریں کر گئے جس سے تمام عالم کو اسلام کا گرویدہ بنادیا تو جس چیز کو ہم قدرت نبویہ سے خارج اور تائید الٰہی کا ثمرہ سمجھتے ہیں اس کو وہ حضور ﷺ کی عقل کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو اس طرح گویا کفار نے حضور ﷺ کو ہم سے بھی زیادہ عاقل سمجھا تو وہ ’’ اَعْقَلُ النَّاسِ ‘‘ فرماتے ہیں:((کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ))(۱) ’’حلال کی طلب فریضہ خداوندی کے بعد فرض ہے‘‘ یعنی دنیا کی ضروری مقدار حاصل کرنے کو حضور ﷺ فرض فرمارہے ہیں آپ لوگ تو دنیا کی طلب کو محض واجب العقل ہی کہہ رہے ہیں (۲) اور حضور ﷺ اس کو فرض شرعی فرماتے ہیں جس کے ترک پر عذاب آخرت ہوگا غرض بقدرِ ضرورت کسب دنیا ممنوع نہیں۔

---

(۱) حلیة الاولیاء: ۱۶۲/۷ (۲) طلبِ دنیا کو عقلاً ہی واجب کہتے ہیں۔

دنیا کی محبت ممنوع ہے

البتہ اس کی محبت اور دل میں اس کی وقعت کرنا ممنوع ہے خواہ پیرائیہ مذمت ہی میں ہو اسی لئے حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا تھا: (قُوْمُوْا عَنِّیْ فَاِنَّکُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا) ''میرے پاس سے اُٹھ جاؤ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو'' اس پر ان زاہدوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم تو دنیا کی مذمت کررہے ہیں ہم محبِ دُنیا کدھر سے ہوگئے؟ فرمایا: (مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہ) جس کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بہت کیا کرتا ہے۔ تمہارے دل میں دنیا کی کچھ تو وقعت ہے تو اس کی مذمت کرنے بیٹھے، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی دل میں کچھ بھی وقعت نہ ہو اس کا ذکر مذمت سے (۱) بھی نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ جب ہم لوگ مجلس میں بیٹھتے ہیں تو عہدہ داروں کی مذمت کرتے ہیں۔ چمار کی مذمت (۲) نہیں کرتے کیونکہ چمار کی ہماری نظر میں کوئی وقعت نہیں اور عہدہ داروں کی وقعت ہے۔

اشکال کا جواب

یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہوسکتا ہے شاید کسی طالب علم کے ذہن میں یہ اشکال آیا ہو وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت کی ہے تو کیا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بھی اس کی وقعت تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں تو اس کی وقعت نہ تھی مگر امت میں بعض لوگ اس کے رنگ وروپ پر فریفتہ ہونے والے اور اس کی وقعت کرنے والے تھے (۳) اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی مذمت کی (۴) ضرورت ہوئی اگر

(۱) بُرائی سے (۲) بھنگی کی برائی کوئی نہیں کرتا (۳) بعض لوگ اس کے رنگ روپ پر مرمٹنے والے اور اس کی قدر ومنزلت کرنے والے تھے (۴) بُرائی کی۔

امت میں بھی کوئی اس کی وقعت کرنے والا نہ ہوتا تو حضور ﷺ کبھی بھی اس کی مذمت نہ فرماتے، چنانچہ پیشاب یا پاخانہ کی مذمت حضور ﷺ نے نہیں فرمائی کیونکہ اس سے سب کو نفرت ہے اور شراب کی مذمت فرمائی کیونکہ اس سے سب کو نفرت نہیں بلکہ بعضے اس کے فریفتہ ہیں گو حضور ﷺ کی نظر میں یہ بھی پیشاب پاخانہ ہی کے مثل تھی مگر بعض افرادِ امت کی رغبت کی وجہ سے مذمت خمر (شراب) کی ضرورت ہوئی غرض دنیا کی حضور ﷺ نے بضرورت مذمت فرمائی ہے اور جو لوگ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کے پاس حاضر تھے ان کو کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں دنیادار کون تھا، سارے زاہد ہی جمع تھے مگر زاہدین بعض دفعہ امراء سے اعراض کرنے اور انکے ہدایا واپس کرنے کا تذکرہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اپنا کمال ظاہر ہو اس پر تفاخر مقصود ہوتا ہے گو بظاہر اس تذکرہ میں دنیا کی مذمت ہی کی جاتی ہے مگر حقیقت میں یہ شخص طالب دنیا ہے کیونکہ طالب جاہ ہے (۱) اور جاہ بھی طلب دنیا ہی ہے محقق اس مذمت سے بھی تاڑ لیتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی وقعت ہے ؎

بہر رنگے کہ جامہ می پوش من اندازِ قدت رامی شناسم

''جس رنگ کا کپڑا پہن لے گا قد کے انداز سے میں تجھ کو پہچان لوں گا''

مذمت دنیا کی وجوہ

غرض مذمت دنیا تین وجہ سے ہوتی ہے یا بغرض محمود یا بغرض مذموم یا بلا فائدہ (۲)، مذمت بغرض محمود تو دین ہے (۳) جیسا انبیاء علیہم السلام اور کاملین کے کلام میں دنیا کی مذمت ہے اور بغرض مذموم (۴) جیسے مذمت کرکے اپنا کمال ظاہر کرنا مقصود ہو یہ مذمت نہیں بلکہ حقیقت میں طلب دنیا ہے اور مذمت بلا فائدہ یہ گو

(۱) بڑائی کا طالب ہے (۲) دنیا کی بُرائی تین وجہ سے کی جاتی ہے اچھی غرض سے بُری غرض سے یا بلا فائدہ (۳) اچھی غرض سے بُرائی کرنا تو دین ہے (۴) بُری غرض سے ذکر کرنا۔

طلب دنیا نہ ہو مگر محبت دنیا کی علامت ہے (۱) کیونکہ ؎

گر ایں مدعی دوست بشناختے　　بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

''اگر یہ مدعی محبوب کا عارف ہوتا تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا''

جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے وہ محبوب کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے بلا فائدہ دشمن کا ذکر نہیں کیا کرتا غالباً حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کے پاس والے بلا فائدہ مذمت کر رہے تھے اس لئے اُن کو تنبیہ فرمائی۔

((اعوذ باللّٰہ)) پڑھنے کا حکم اور فائدہ

اسی اصل پر (۲) حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ شیطان پر لعنت کبھی نہ کرتی تھیں اور یہ فرماتیں کہ میں دوست کا ذکر چھوڑ کر دشمن کا ذکر کیوں کروں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تلاوت قرآن کے وقت ((اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ))''میں شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں'' بھی نہ پڑھا جائے جیسے بعض بزرگوں کی حکایت سے اس کا شبہ ہو سکتا ہے وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بزرگ کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے مگر دفعۃً سامنے حاضر نہیں ہوئے، بلکہ حجرہ (۳) سے باہر ٹھہرے اور توقف کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ کس شغل میں ہیں (۵) اس وقت دوسرے بزرگ تلاوت قرآن کا قصد کر رہے تھے (۶) حسب معمول انہوں (اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم) پڑھا اور فوراً ہی فرمایا کہ اے شیطان میں تجھ سے پناہ اس واسطے نہیں چاہتا کہ میں تجھ سے کچھ ڈرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ بدون حکم الٰہی (۷) کے تو کچھ نہیں کر سکتا مگر بوجہ امر الٰہی (۸) کے تجھ سے پناہ چاہتا ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاِذَا

(۱) بے فائدہ بُرائی میں اگرچہ دنیا طلبی نہ ہو لیکن دنیا سے محبت کی علامت ہے (۲) اسی اصول کی وجہ سے (۳) اچانک سامنے حاضر نہیں ہوئے (۴) کمرے سے باہر (۵) اور ٹھہر کر یہ بات معلوم کرنا چاہی وہ اس وقت کونسی عبادت میں مشغول ہیں (۶) قرآن کی تلاوت کا ارادہ کر رہے تھے (۷) بغیر اللہ کے حکم کے (۸) مگر اس لئے پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ نے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔

قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ 3 اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ 4 اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ 5 ﴾ (۲) اس میں حق تعالیٰ نے یہ بھی بتلادیا کہ مومنین متوکلین پر شیطان کا قابو نہیں چل سکتا مگر پھر بھی سید المتوکلین ﷺ کو امر ہے تلاوتِ قرآن کے وقت (اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم) کہہ لیا کیجئے تاکہ عبدیت اور عجز کا اظہار ہو کہ ہم ایسے عاجز ہیں کہ بے حقیقت سے بھی پناہ چاہتے ہیں یہ سن کر ان زائر (۳) بزرگ کو حیرت ہوگئی کہ اللہ اکبر انکا کیسا عالی مقام ہے (۴)۔

سو اس حکایت کے اول جزو سے ترک تعوذ کا (۵) شبہ ہوسکتا تھا مگر اسی کے دوسرے جزو میں اس کا جواب بھی مذکور ہے اور میں کہتا ہوں کہ ان بزرگ کو جو یہ حالت نصیب ہوئی کہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں شیطان سے بے خطر (۶) ہوگئے یہ بھی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھنے ہی کا اثر تھا یعنی پہلے سے جو وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھتے آئے ہیں اس کی برکت سے حق تعالیٰ نے یہ حالت عطا فرمائی کہ شیطان سے بے خوف ہوگئے اور وہ ساری عمر سے اس کو نہ پڑھتے تو یہ حالت نصیب نہ ہوتی تو اس کا بھی مقتضا یہی ہے کہ اس کی اور کثرت کریں۔

خوفِ خدا سے رونے کا فائدہ

جیسے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اُن کا گذر ایک پتھر پر ہوا جو بہت رو رہا تھا موسیٰ علیہ السلام نے رونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا جب سے میں نے یہ سنا ہے ﴿ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ ''اس (دوزخ) کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں'' کہ جہنم میں پتھر بھی جائیں گے اُس وقت سے مارے خوف کے رو رہا ہوں

(۱) ''تو جب آپ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں یقیناً اسکا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں بس اس کا قابو تو صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اُس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں'' سورۂ نحل: ۹۸ تا ۱۰۰ (۲) ملاقات کے لئے آنے والے بزرگ (۳) بلند مرتبہ (۴) اس حکایت کے پہلے جز سے اعوذ باللہ کے چھوڑنے کا شبہ ہوسکتا تھا (۵) بے خوف ہوگئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو جہنم میں نہ ڈالا جائے وحی نازل ہوئی کہ دعا قبول ہوگئی اس کی تسلی کر دیجئے کہ اس کو جہنم میں نہ ڈالا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بشارت سنادی بہت خوش ہوا اور رونا موقوف کر دیا موسیٰ علیہ السلام آگے تشریف لے گئے واپسی میں پھر اُس پر گذر ہوا تو دیکھا اب بھی رو رہا ہے، پوچھا اب کیوں روتا ہے؟ کہا اے موسیٰ! رونے ہی کی بدولت تو یہ بشارت نصیب ہوئی تھی تو جس چیز سے مجھے یہ دولت ملی اُسے کیونکر چھوڑ دوں۔

تسبیح ہاتھ میں لینے کا فائدہ

اسی طرح حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے دیکھا کہ تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو کامل و منتہی ہیں (۱) آپ کے تو رگ و پے میں ذکر سرایت کر چکا ہے۔ کہا تسبیح ہی کی بدولت تو یہ حالت حاصل ہوئی ہے تو کیا ایسے رفیق کو چھوڑ دوں جس سے یہ دولت ملی، سبحان اللہ خوب فرمایا سمجھدار لوگ اس کی حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں وہ اس میں سہو (۲) نہ کریں گے گو اہل شکر یہی کہتے ہیں کہ ہم کو تسبیح کی کیا ضرورت ہے خیر یہ تو جواب تھا درمیان میں ایک شبہ کا بطور جملہ معترضہ کے۔

دنیا کی حقیقت

اب پھر عود کرتا ہوں اصل مضمون کی طرف وہ یہ کہ بزرگوں نے بے فائدہ باتوں سے یہاں تک احتراز کیا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا بے ضرورت شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں پھر دنیا کی مذمت بے فائدہ کو وہ کیسے گوارا کرتیں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ دین کے ساتھ ہم دُنیائے مذموم کا ذکر بھی کرنا نہیں چاہتے البتہ کبھی کبھی دنیائے محمودہ کا ذکر کر دیتے ہیں بس دنیا کے لئے اتنا ہی فخر کافی ہے، باقی وہ اس قابل تو ہے ہی نہیں کہ اسکا انفراداً ذکر کیا جائے کیونکہ وہ ہیچ اور

(۱) آپ تو درجہ کمال کو حاصل کر چکے پھر تسبیح کی کیا ضرورت (۲) اس کو ترک کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔

لاشئی ہے(۱) اور اس مضمون کو عجیب نہ سمجھو کیونکہ قوی کے سامنے ضعیف شئے بے حقیقت ہی ہوتی ہے اسی طرح آخرت کے سامنے دنیا بے حقیقت ہے جو انفرداً(۲) تو کسی طرح قابل ذکر ہے ہی نہیں اور گو یہ مضمون پُرانا ہے مگر میں کہہ چکا ہوں کہ پرانا ہونے سے مضمون بے وقعت نہیں ہوسکتا۔

مضامین میں تکرار کی مثال اور فائدہ

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ مضمون تو بے وقعت نہیں مگر اس کے بیان کی ضرورت کیا ہے کیونکہ یہ تو بارہا کا سنا ہوا ہے پھر تکرار فضول ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کا تکرار فضول اور بے ضرورت نہیں ہوتا اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کھانا کھایا کرتے ہیں جو ہر دن مکرر(۳) ہوتا ہے بلکہ دن میں چار دفعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اول تو صبح ہی یار دوست جمع ہوکر چائے نوشی کرتے ہیں(۴) جو بقول حضرت مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ثقہ لوگوں کی بھنگ ہے تو صبح ہی یہ بھنگ یعنی چائے اُڑائی جاتی ہے جس کے ساتھ بسکٹ اور انڈے وغیرہ بھی ہوتے ہیں جو خاصی غذا ہے پھر دوپہر کو اور اس کے بعد شام کو کھانا کھایا جاتا ہے پھر رات کو دودھ یا چائے پی کر سوتے ہیں اور چائے کو میں نے کھانا اس لئے شمار کیا کہ اگر یہ نہ ہو تو ایسی بے چینی ہوتی ہے گویا کھانا ہی نہیں کھایا، جیسا مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ آپ کے یہاں ایک بنگالی مہمان ہوا تھا مولانا گھر والوں کو کھانا کھلانے کی تاکید فرما کر مدرسہ وغیرہ میں چلے گئے واپسی میں مہمان سے پوچھا کہ آپ نے کھانا کھالیا کہنے لگے نہیں مولانا گھر میں آکر ناخوش ہونے لگے، گھر والوں نے کہا ہم تو کھانا کھلا چکے، مولانا کو حیرت ہوئی سوچنے سے یہ بات سمجھے کہ یہ لوگ چاول کو کھانا کہتے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ روٹی گئی تھی چاول نہ تھے، وہ لوگ چاول ہی کو کھانا کہتے ہیں اسی

(۱) اس لئے کہ وہ بالکل حقیر اور بیکار چیز ہے (۲) تنہا (۳) ہر روز بار بار کھاتے ہیں (۴) چائے پیتے ہیں۔

طرح جب چائے کے بدون کھانے سے قناعت نہیں (۱) ہوتی تو انکا کھانا چائے ہی ہوئی اس طرح چار بار کھانا کھاتے ہیں۔

غرض کھانے کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے تکرار کی وجہ سے کوئی اس کو بے ضرورت نہیں کہتا نیز نئی شادی والے سوچیں کہ وہ روز روز بیوی کے پاس کیوں لیٹتے ہیں چاہیئے کہ ہر دن نئی شادی کیا کریں ایک دن کے بعد پھر پہلی بیوی کے پاس نہ جایا کریں کیونکہ اب تو وہ مکرر ہے (۲) مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ بیوی سے مل کر اس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اللہ! ایک ادنیٰ سے جمال سے تو سیری نہ ہو (۳) اور حضرت حق سے سیری ہوگئی کہ اُن کے احکامات ایک دفعہ سن کر پھر بے ضرورت ہوگئے (۴)۔

دیدارِ حق کا شوق و بے قراری

شاید تم یہ کہو کہ یہاں تو بار بار شوق بڑھتا ہے اور وہاں کیا بڑھتا ہے ارے جن پر حضرت حق کی محبت کا غلبہ ہے اُن سے پوچھو کیا بڑھتا ہے اِسی کی تو شکایت ہے کہ ہم کو حضرت حق کے ساتھ تعلق نہیں جن کو تعلق ہے اُن کی تو یہ حالت ہے ؎

دیدہ از دیدنش نگشتے سیر　　ہمچناں کز فرات مستسقی

''آنکھ اس کے دیکھنے سے سیر نہیں ہوتی جس طرح جلندھر والا دریائے فرات سے سیر نہیں ہوتا'' (۵)

اور فرماتے ہیں ؎

دلارام در بر دلارام جوئے　　لب از تشنگی خشک و برطرف جوئے

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند　　کہ برساحل نیل مستسقی اند

(۱) چائے کے بغیر صرف کھانا کافی نہیں ہوتا (۲) کیونکہ اس میں بھی تو تکرار پایا جاتا ہے (۳) دل نہ بھرے (۴) احکام الٰہی سے دل بھر گیا کہ ایک دفعہ سن کر دوبارہ سننے کو بلاضرورت کہنے لگے (۵) جس کو استسقی (پیاس) کا مرض لاحق ہوگیا ہو پانی پینے سے اس کی پیاس نہیں بجھتی۔

''محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈھ رہے ہیں نہر کے کنارہ پر ہیں اور ہونٹ پیاس کی وجہ سے خشک ہیں، یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ نہر کے کنارہ پر جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں''۔

اور یہاں تو انکشاف جمال ایک حالت اور ایک حد پر ختم بھی ہوجاتا ہے(۱) مگر پھر بھی اُس سے سیری نہیں ہوتی تو جہاں انکشاف ہر دم بڑھتا(۲) رہتا ہے وہاں کیا حال ہوگا جمال حق کے انکشاف کی تو یہ حالت ہے ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

''عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جیسا انگور کو جتنا قطع کیجئے اور بڑھے گا''

اور اُن کے جمال کی یہ شان ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی ودریا ہمچناں باقی

''نہ محبوب کے حسن کے انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے جلندھر والا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے محبوب کے حسن کا بیان باقی ہوگیا''

اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

قلم بشکن درسیاہی ریز وکاغذ سوز ودم درکش　　حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

''یعنی قلم توڑ روشنائی کو بکھیر اور کاغذ جلا خاموش رہ وہ حسن عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا''

---

(۱) حسن وجمال ایک حد پر جا کر ختم ہوجاتا ہے یعنی بڑھاپے میں (۲) اللہ کا حسن وجمال تو انسان پر ہر دم سرید کھلتا چلا جاتا ہے اس کے اختتام کی کوئی حد نہیں۔

بلکہ محققین کا قول ہے کہ ترقی معرفت جنت میں بھی نہ ختم نہ ہوگی وہاں بھی ترقی ہوتی رہے گی۔ حتی کہ بعض اہل حال کا قول ہے کہ جنت میں ایک جماعت ہوگی جو نہ قصور پر توجہ کرینگے نہ حوروں پر بلکہ وہ ہردم ((اَرِنِیْ اَرِنِیْ)) ''مجھ کو جلوہ دکھا مجھ کو جلوہ دکھا'' کہیں گے کیونکہ وہاں انکشاف متزائد ہے (۱) اس لئے ہر تجلی کے بعد دوسری تجلی کا اشتیاق ہوگا اور اس کی لذت کے سامنے حور وقصور سب ہیچ معلوم ہوں گے (۲)۔ ہم نے دنیا میں خود بھی ایسے لوگ دیکھے ہیں جو حوروں کے طالب نہ تھے محض خدا تعالیٰ کے طالب تھے مگر یہ باتیں ان لوگوں سے معلوم ہوتی ہیں جو کسی قدر مجذوب بھی ہوں یعنی جن پر جذب کا غلبہ ہو۔

عارفین کا حال

عارفین کاملین ایسی باتیں ظاہر نہیں کرتے اسی لئے عارف فرماتے ہیں ؎

رازدروں پردہ زرنداں مست پرس کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

''پردہ کے اندر کا حال مست اندروں سے پوچھ اس لئے یہ حال عالی مقام صوفی کا نہیں ہے''

وجہ یہ کہ صوفی عالی مقام اپنے حال پر غالب ہوتا ہے (۳) اس لئے وہ ضبط کئے ہوئے رہتا ہے (۴) اسرار کو ظاہر نہیں کرتا، یا تو بوجہ غیرت کے اسرار پر اس وقت تو وہ یوں کہتا ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

''مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرۂ انور کو نہ دیکھنے

(۱) وہاں اللہ کی تجلیات کا خوب اظہار ہوگا ایک کے بعد دوسری تجلی کے اظہار کا شوق ہوگا (۲) تجلی حق سے جو لذت حاصل ہوگی اس کے سامنے جنت کے محلات اور حوروں کی کوئی حیثیت نہ ہوگی (۳) بلند مرتبہ صوفی اپنے حال پر غالب ہوتا ہے (۴) وہ برداشت کرتا ہے اور لوگوں پر ان کیفیات کا اظہار نہیں کرتا۔

دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں''

اور یا بوجہ مخاطب کے معاند ہونے کے اس وقت یوں کہتا ہے ۔

با مدعی مگو اسرار عشق و مستی بگذار تابمیرد در رنج خود پرستی

''عشق و مستی کے اسرار مدعی کے سامنے مت بیان کرو اس کو اس کی حالت پر چھوڑ و رنج و خود پرستی میں مرنے دو''

اور یا اس لئے ظاہر نہیں کرتا کہ مخاطب میں اسرار دقیقہ کے سمجھنے کی اہلیت نہیں، جیسے مولانا فرماتے ہیں ۔

نکتہا چوں تیغ فولادست تیز چوں نداری تو سپر واپس گریز

''بہت سے مضامین باریک فولادی تیغ کی طرح تیز ہوتے ہیں اگر تیرے پاس سپر (فہم) نہ ہو تو پیچھے ہٹ جا''

سپر سے (۱) مراد فہم ہے

پیش ایں الماس بے اسپر میا کز بریدن تیغ را نبود حیا

''اس تیغ آبدار (مسائلِ دقیقہ) کے روبرو بے سپر (فہم) نہ آنا چاہیئے کیونکہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی''

اس مقام پر مولانا نے اُن لوگوں کی بہت خبر لی ہے جو بے دھڑک ہر اک کے سامنے اسرار کو ظاہر کرتے پھرتے ہیں چاہے مخاطب میں فہم ہو یا نہ ہو فرماتے ہیں ۔

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند از سخنہا عالمے را سوختند

''بڑے ظالم تھے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم

(۱) سمجھ۔

کو ویران کر دیا (مراد ظالم سے صوفیا کے باطل فرقے ہیں)''

غرض مولانا نے سامع اور متکلم (۱) دونوں کا انتظام کیا ہے کہ اگر متکلم مغلوب الحال نہ ہو (۲) جب تو اُس کو تنبیہ کی ہے کہ ہر ایک کے سامنے اسرار کو ظاہر نہ کرو اور اگر وہ مغلوب الحال ہو تو سامع کو تنبیہ ہے کہ اسرار دقیقہ کو نقل نہ کرو (۳) نہ خود اُن میں تامل کرو، اسی لئے ہمارے حضرات تو ان باتوں کی رسید ہی نہیں دیتے گو وہ خود رشید ہی ہوں (۴) اور اگر بعضے کسی وقت ظاہر بھی کرتے ہیں تو ہر اک کے سامنے نہیں ظاہر کرتے بلکہ مجمع خاص میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔

اصلاح کے لئے سختی و نرمی دونوں کی ضرورت ہے

چنانچہ ایک بار مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میں حاضر تھا تنہائی کا وقت تھا خاص مجمع تھا ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ تھی جب کوئی آتا تو اس پر ڈانٹ پڑتی، ضرورت ہے ایسے بزرگوں کی بھی جو کبھی کبھی مریدوں کو ڈانٹ دیا کریں بعضے تو بہت ہی سختی کرتے ہیں ایسی سزائیں اور قاعدے مقرر کرتے ہیں جیسے سلاطین (۵) کے یہاں انتظام ہوتا ہے یہ تو اچھا نہیں کہ خلاف سنت ہے اور بعضے بہت نرمی کرتے ہیں کہ مریدوں کو کسی بات پر تنبیہ ہی نہیں کرتے یہ بھی زیبا نہیں بس نرمی اور گرمی دونوں چاہئیں اس سے اعتدال ہو جائے گا جیسے ایک بزرگ سے کسی سانپ نے بیعت کر لی تھی انہوں نے اُس سے یہ عہد لیا کہ کسی کو ڈسنا نہیں جانوروں نے جو دیکھا کہ یہ کسی کو کچھ کہتا ہی نہیں تو نڈر ہو کر سب نے اس کو مارنا اور

(۱) سننے والے اور بولنے والے (۲) حال غالب نہ ہو (۳) اگر اس پر حال غالب ہے اس صورت میں اس کے منہ سے کوئی کلمہ نکل گیا تو وہ معذور ہے تم اس کو دوسروں پر ظاہر نہ کرو (۴) ہمارے حضرات تو ان باتوں کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتے چاہے وہ خود سورج کی طرح روشن ہوں اور ان کو سب باتیں پتہ ہوں (۵) جیسے بادشاہوں کے یہاں ہوتے ہیں۔

تنگ کرنا شروع کیا چند روز کے بعد وہ بزرگ کے پاس آیا تو دیکھا بہت ہی بُری حالت میں ہے پوچھا کیا حال ہے؟ کہا حضور نے کاٹنے سے منع کر دیا تھا جانوروں کو جو یہ خبر لگی تو اب سب مجھے تنگ کرنے لگے، فرمایا میں نے کاٹنے ہی سے تو منع کیا ہے پھنکارنے سے تو نہیں منع کیا بس اب سے جو جانور پاس کو آئے فوراً پھنکار دیا کہ وہ بھاگ جائے گا اس روز سے غریب کو چین ملا اسی طرح بزرگوں کو بھی چاہیئے کہ کبھی کبھی پھنکار دیا کریں۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال

غرض اُس وقت ایسی تنہائی تھی کہ حضرت مولانا نے ایسی خاص باتیں فرمائیں جو لوگوں کے سامنے کہنے کی نہ تھیں منجملہ ان کے ایک یہ بات بھی فرمائی کہ جب ہم جنت میں جائیں گے (گویا اس کا تو اطمینان تھا ۱۲ظ) اور حوریں ہمارے پاس آئیں گی تو ہم کہہ دیں گے کہ بی اگر قرآن سناؤ تو ہمارے پاس بیٹھو ورنہ بس جاؤ۔ مگر مولانا نے یہ بات یہاں کی حالت کے اعتبار سے فرمائی جس کو میں غلبۂ حال پر محمول کرتا ہوں اس وقت مولانا کی نظر اس پر نہ تھی کہ جنت میں معرفت ایسی کامل ہوگی کہ حور کی طرف التفات کرنے سے بھی توجہ الی الحق (۱) میں کمی نہ آئیگی۔

جنت میں عارفین کی دو قسمیں

عارفین کاملین حور سے بھی نظر خدا تعالیٰ ہی پر کریں گے اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

''تو نے اپنے حسن کو حسینوں کے چہرے سے ظاہر کیا ہے۔ پھر اپنے

(۱) حوروں کی طرف متوجہ ہونے سے بھی اللہ کی طرف توجہ میں کمی واقع نہیں ہوگی۔

عاشقوں کی آنکھ میں تماشا کیا ہے‘‘

اس کی ایسی مثال ہے کہ محبوب نے ایک وقت مقرر کر دیا ہو کہ اس وقت میں بلاواسطہ رویت ہوگی (۱) اور دوسرے وقت میں ایک آئینہ دے دیا کہ ہم کو اس میں سے دیکھو، اسی طرح حوریں عارفین کاملین کے لئے مرآۃ جمال حق ہوں گی (۲)۔ تو جنت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک کاملین وہ تو دونوں صورتوں میں جمال حق ہی کا مشاہدہ کریں گے (۳)۔ دوسرے ناقصین وہ ایک رُخے ہونگے کہ صرف ((ارنِی ارنِیُ)) مجھ کو اپنا جلوہ دکھا مجھ کو اپنا جلوہ دکھا پکاریں گے ان کو کسی دوسری شئے کی طرف توجہ نہ ہوگی۔ (۴) مگر یہ ناقصین کاملین کے سامنے ناقص ہیں ہم سے آپ سے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیشِ خاک تود

’’یعنی آسمان اگرچہ عرش کی بہ نسبت پست ہے۔ مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے بہت بلند ہے‘‘

حسنِ الٰہی کی حقیقت

غرض خدا تعالیٰ کے شوق میں مست ہونا جنت میں تو ہوگا ہی، ہم نے تو یہاں بھی ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو حسن و جمال حق میں ایسے مست تھے کہ حوروں کی طرف بھی التفات نہ کرتے تھے مگر تم نے حسنِ حق کو سمجھا کیا ہے حق تعالیٰ شانہ کا حسن کوئی چراغ جیسی روشنی نہیں ہے بہت لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں یہ غلط ہے انہوں نے حق تعالیٰ کے حسن کی قدر ہی نہیں کی وہ حسن تو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت

(۱) بغیر کسی واسطے اور ذریعہ کے دیدار خداوندی ہوگا (۲) حوریں کاملین کے لئے اللہ تعالیٰ کے جمال کو دیکھنے کا آئینہ ہوں گی (۳) دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کا جمال دیکھیں گے (۴) دوسری چیز کی طرف توجہ نہ ہوگی۔

یہاں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی اس لئے بزرگوں کا ارشاد ہے: ''مَاخَطَرَ بِبَالِكَ فَهُوَ هَالِكٌ وَاللّٰهُ اَجَلٌّ مِنْ ذٰلِكَ '' کہ اس وقت جو کچھ دل میں انوار و تجلیات نظر آتی ہیں وہ سب ہالک و فانی (۱) ہیں حق تعالیٰ ان سب سے بالا و برتر ہیں۔

بعض سالکین کی غلطی

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو انوار قلب کو یا انوار ذکر کو نور حق سمجھ لیتے ہیں (۲) اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں ایک سالک تجلی روح کو تیس برس تک تجلی ذاتِ حق سمجھتے رہے (۳) بعد میں تنبہ ہوا تو اس سے توبہ کی (۴) غرض یہاں حسن و جمال کی حقیقت اور کیفیت معلوم نہیں ہوسکتی اور حقیقت تو آخرت میں بھی معلوم نہ ہوگی۔

نورِ الٰہی کا اظہار آخرت میں ہوگا

مگر وہاں انکشاف صحیح ہوگا اسی کو سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اے برتر از خیال و قیاس گمان و وہم — وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

''اے اللہ تعالیٰ آپ وہم و گمان خیال و قیاس سے بالاتر ہیں اور جو کچھ بزرگوں نے کہا اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی برتر ہیں دفتر تمام ہوگیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کر سکے''

ہاں جب انکشاف کا وقت آئے گا اس وقت یوں ترنم کیجئے گا ؎

(۱) ہلاک ہونے والے اور ختم ہونے والے ہیں (۲) ذکر کے نور یا قلب کے نور کو اللہ کا نور سمجھتے ہیں (۳) روح کی تجلی کو اللہ کی تجلی سمجھتے رہے (۴) بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس سے توبہ کی۔

بے حجابانہ درآ ازدر کاشانۂ ما کہ کسے نیست بجز درد تو درخانۂ ما

''یعنی ہمارے کاشانہ قلب بے حجابانہ آ، اسی لئے کہ ہمارے خانۂ قلب میں بجز دردِ محبت اور کوئی غیر نہیں ہے''

اس میں وجہ بھی بتلادی کہ اس وقت بے حجابانہ رویت کی (۱) درخواست اس لئے کرینگے کہ اس وقت غیر دل میں نہ ہوگا اور اب غیر دل میں گھسا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کی تجلی غیر کے ساتھ کسی دل پر نہیں ہوسکتی اس کی تو شان یہ ہے ؎

چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم برکشد

''یعنی جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہوجاتی ہیں''

اور اس سے معلوم ہوگیا کہ مانع اِدھر سے ہے اُدھر سے مانع کوئی نہیں (۲) اسی لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے ﴿لَنْ تَرٰنِیْ﴾ فرمایا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے ﴿لَنْ اَرٰی﴾ نہیں فرمایا کہ میں نظر نہیں آسکتا وہ تو ہر وقت نظر آسکتے ہیں مگر یہاں ہماری آنکھوں میں تحمل دیدار (۳) کی طاقت نہیں ؎

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

''یہ آنکھ کے ساتھ پردہ آنکھ پر سات پردہ ہوگئے۔ ورنہ میرا محبوب حقیقی سورج کی مانند بے پردہ ہے''۔

دنیا میں دیدارِ خداوندی کا طریقہ

بس یہاں تو ان کے دیکھنے کی سب سے اکمل یہ صورت ہے کہ قرآن کے اندر اُن کے جمال وجلال کا مشاہدہ کرلیا جائے اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے ؎

(۱) بغیر کسی حجاب اور پردے کے دیدار کی درخواست کرینگے (۲) اللہ کے نظر نہ آنے میں رکاوٹ ہماری طرف سے ہے اُن کی طرف سے نہیں (۳) ہماری آنکھوں میں دیدار الٰہی کو برداشت کرنے کی قوت نہیں۔

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

''میں سخن میں مخفی ہوں جس طرح بو برگ گل میں مخفی ہے جس شخص کو میرے دیکھنے کی خواہش ہے وہ مجھ کو کلام میں دیکھ لے''

اسی طرح گویا دنیا کے اعتبار سے حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ

ع ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

''جو شخص میرے دیکھنے کا خواہشمند ہو وہ مجھ کو میرے کلام میں دیکھ لے''

ابھی قرآن (۱) پڑھا گیا تھا اس وقت سامعین کی کیا حالت تھی اگر کوئی یہ کہے کہ یہ اثر لہجہ اور آواز کا تھا۔

تو میں کہتا ہوں کہ ذرا انہیں قاری صاحب کو کافیہ (۲) دے دیا جائے اور ان سے کہیئے کہ اس کو اسی لہجہ کے ساتھ پڑھیں یقیناً خاک بھی اثر نہ ہوگا یہ شہادت کافیہ ہے اس امر کی کہ دراصل قرآن کا اثر ہے (۳)۔ البتہ لہجہ اور آواز سے بھی اس میں کچھ خوبی آجاتی ہے دوسرے لہجہ اور آواز کا اثر ایک دو دفعہ کے بعد نہیں رہا کرتا اور قرآن میں ایسی حلاوت ہے (۴) کہ جتنا بھی سنا جائے اس سے سیری (۵) نہیں ہوتی۔ کسی حسین صورت سے ایک عمدہ سی غزل سنیئے پہلی بار تو اثر ہوگا مگر تکرار میں جی بھر جائے گا کیونکہ وہ کلام انسانی ہے۔ جب متکلم فانی ہے تو اس کے کلام کی لذت بھی فانی ہے اور قرآن کا چاہے کتنا ہی تکرار کیا جائے اُس سے جی نہیں بھرتا۔ بشرطیکہ پڑھنے والا بے تکلف اور صحیح پڑھتا ہو کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام جیسے وہ خود باقی ہیں اسی طرح اُن کے کلام کی لذت بھی باقی ہے (کثرتِ تکرار سے پرانا نہیں ہوتا ۱۲ ظ)

(۱) وعظ شروع ہونے سے پہلے بعض قراء نے کچھ قرآن جلسہ میں پڑھا تھا ۱۲ (۲) علم نحو کی ایک کتاب کا نام ہے (۳) یہی گواہی کافی ہے اس بات کی کہ یہ تلاوت قرآن کا اثر تھا (۴) مٹھاس ہے (۵) اس سے دل نہیں بھرتا۔

لفظی بالقرآن کی تحقیق

اور گو قرآن یعنی کلام لفظی بدرجۂ کلام نفسی بنا بر تحقیق متکلمین حق تعالیٰ کی صفت ذاتیہ نہ ہو (۱) مگر ذات حق سے اس کو ایسی نسبت ہے جیسی شعاع کو آفتاب سے پس ایک قرص آفتاب ہے کہ وہ اس کی ذات ہے دوسرے اس کی صفت نور ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے تیسری شعاع چوتھی زمین منور یہ شعاع نہ نور قائم بالشمس کی طرح ہے نہ شمس سے متصل ہے اور نہ زمین کی طرح شمس سے بالکل منفصل، اسی طرح کلام لفظی نہ صفات ذاتیہ کی طرح ذات کے ساتھ قائم اور نہ دوسرے حوادث کی طرح بعید التعلق بلکہ باوجود حادث ہونے کے دوسرے حوادث سے زیادہ شدید التعلق اور اسی شدت تعلق کے سبب اس کو کلام اللہ کہا جاتا ہے دوسرے کلام حادث کو کلام اللہ نہیں کہا جاسکتا اور اسی جگہ سے بعض متکلمین نے اس کلام لفظی کو بھی قدیم کہہ دیا ہے گو ظہور اس کا حادث ہو، اور یہ مسئلہ دقیق ہے بلا ضرورت اس میں خوض کرنا بھی جائز نہیں (۲)۔

قرآن کی خوبی

باقی میرا مقصود دونوں قولوں پر حاصل ہے کہ ان الفاظ میں ایک خاص شان ہے جس سے اس میں کہنگی نہیں آتی (۳) پس جب قرآن کے الفاظ سے

---

(۱) قرآن کی دو حیثیتیں ہیں ایک لفظی بالقرآن یعنی قرآن کے وہ الفاظ جو ہم پڑھتے ہیں دوسری نفسی بالقرآن یعنی وہ کلام جس کا تکلم اللہ نے کیا (۲) یہ مسئلہ مشکل ہے عوام کے سمجھنے کا نہیں حضرت کے وعظ کو سننے والے چونکہ علماء بھی تھے جو اس مسئلہ کی باریکی کو سمجھ سکتے ہیں اس لئے اس کو ذکر کیا گیا جس کی سمجھ میں نہ آئے اپنا قصور سمجھے (۳) پرانا پن نہیں آتا۔

جی نہیں بھرتا تو اس کے معانی سے کیونکر سیری ہوسکتی ہے اور اس پر عمل کرنے کے انوار سے کیونکر جی بھرسکتا ہے۔ واللہ جو لوگ انوار معانی قرآن سے اور انوار اعمال سے مشرف ہو چکے ہیں ان کو کبھی سیری نہیں ہوتی اور نہ ان کو کسی حد پر چین ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں ان کو بڑے چین کے ساتھ بھی چین نہیں یعنی ان کو اس بے چینی میں ایسا چین ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت اس کے سامنے حقیر ہے۔ غرض جب قرآن شریف کی یہ حالت ہے تو اس کے مضامین سے سیری کیونکر ہوسکتی ہے اور احکام الٰہی کے ذکر سے جی کس طرح بھرسکتا ہے، لہذا گو یہ مضمون پرانا سنا ہوا ہے مگر اس کا تکرار بے فائدہ نہیں ہے بلکہ قند مکرر کا سا تکرار ہے۔

تکرارِ مضمون کی وجہ

دوسرے اگر پرانی بات چھوڑنے کے قابل ہے تو یہ آپ کا شبہ بھی تو پرانا ہے آپ ہی اس شبہ کو جانے دیجیئے۔ جب میں قنوج گیا تھا تو وہاں ایک محلّہ والوں نے اپنے محلّہ کا نام اس لئے بدل دیا تھا کہ پہلے نام میں اس کی قومیت ظاہر ہوتی تھی اس کو چھپانے کے لئے نام بدلا گیا، میں نے اس پر ایک وعظ کہا تھا دوبارہ جب پھر گیا تو وعظ میں پھر اس کا ذکر ہوا، اس محلّہ کے لوگوں نے کہا کہ ہمارے پیچھے پڑ گئے پہلے بھی وعظ میں ہم کو بُرا بھلا کہا تھا اب پھر وہی کہا، ایک صاحب نے جواب دیا کہ تم نے خود ہی کہلوایا ہے اُس نے نہیں کہا اگر تم اول ہی اصلاح کر لیتے تو دوبارہ کہنے کی کیوں نوبت آتی (۱) پس اسی طرح آپ کہلوا رہے ہیں اگر آپ پہلے مضامین کو سن کر اپنی اصلاح کر لیتے تو مجھے وہی مضمون دوبارہ کہنا نہ پڑتا یہ تو تمہید تھی۔

(۱) کیوں ضرورت پیش آتی۔

انتخاب مضمون کی وجہ

اب میں اصل مقصود شروع کرتا ہوں۔ یہ آیت جو میں نے اِس وقت تلاوت کی ہے اتفاق سے جب میں جلسہ میں آیا تو تالی (پڑھنے والا) یہی آیت پڑھ رہا تھا اُسی وقت میرے خیال میں آیا کہ آج اسی آیت کا بیان کروں گا کہ یا حق تعالیٰ نے فعلاً اس آیت کے بیان کو ترجیح دیدی۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے دنیائے مذموم سے منع فرمایا ہے اور آخرت کی ترغیب دی ہے(۱) مگر عنوان دونوں جگہ ایسا عجیب ہے جس سے دنیا وآخرت دونوں کی اصلی حقیقت تھوڑے سے لفظوں میں ظاہر فرمادی واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں کرسکتا۔

مال واولاد کی حقیقت

اس آیت سے پہلے دُنیا کا بے حقیقت ہونا ایک مثال سے ظاہر فرمایا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾(۲)

اس کے بعد یہ آیت ہے: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کہ ''مال اور اولاد حیات دُنیا کی زینت وآرائش ہیں'' اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زینت ہر چیز کی اُس کے تابع ہوا کرتی ہے اور جب تابع ہے تو اس کا مرتبہ اصل سے کم ہوا اور متبوع (۳) کا بے حقیقت ہونا پہلے یعنی اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا

(۱) ناپسندیدہ دنیا کے حصول سے منع کیا اور آخرت کا شوق دلایا (۲) ''اور آپ ان لوگوں سے دینوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسی آسمان سے ہم نے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئیں ہوں پھر وہ ریزہ ریزہ ہوجاوے کہ اسکو ہوا اڑائے لیئے پھرتی ہو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں سورۂ کہف: ۴۵ (۳) مال واولاد کا مرتبہ تابع ہونے کی وجہ سے دنیا سے بھی کم اور دنیا کی بے وقعتی پہلے معلوم ہوچکی تو اولاد کا درجہ معلوم ہوگیا۔

ہے اس سے خود ہی معلوم ہوگیا کہ اس کا تابع کیسا کچھ ہوگا، تو ایک لفظ زینت سے اس قدر ان کی بے وقعتی کو واضح فرمایا ہے عجیب فصاحت و بلاغت ہے، اور اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ آرائش اور زینت کی چیزیں اکثر فضول اور زائد اور بے ضرورت ہوا کرتی ہیں تو حق تعالیٰ نے مال اور بنون کا بے حقیقت و بے ضرورت ہونا لفظ زینت سے ظاہر فرمادیا ہے کہ یہ سب زینت ہی زینت ہیں اور کچھ نہیں پس مطلب یہ ہے کہ جو مال واولادتم کو مطلوب ہے جس میں آخرت کو چھوڑ کر تم منہمک ہورہے ہو وہ بے ضرورت اور زائد چیزیں ہیں کیونکہ مال سے مقصود رفع ضرورت (۱) ہے اور رفع ضرورت سے مطلوب بقاء النفس ہے (۲) تو اصل مقصود کے لئے بواسطہ در واسطہ ہے پھر ایسے واسطے کو مطلوب بنالینا حماقت ہی نہیں کہ رات دن اُسی میں منہمک ہو اور بقاء نفس (۳) جو مطلوب ہے وہ بھی بے حقیقت ہے کیونکہ اسکا بقاء چند روزہ ہے جو قابل اعتبار نہیں۔ غرض مال خود مطلوب بنانے کے قابل ہرگز نہیں اور اولاد تو اس سے بھی گھٹیا ہے کیونکہ وہ تو بقاء نفس کے لئے بھی نہیں صرف بقاء نوع کے لئے مطلوب ہے (۴) اور بقاء نوع کے لئے اسی کی کیا ضرورت ہے کہ آپ ہی کے اولاد ہو اگر میرے اولاد نہ ہوئی اور آپ کے دو ہوگئیں تو اس سے بھی بقاء نوع ہوسکتی ہے دوسرے بقاء نوع کی آپ کو کیا فکر ہے (۵) جب تک حق تعالیٰ کو انسان کی آبادی دنیا میں مطلوب ہے اس وقت تک وہ اس کی تدبیریں کریں گے آپ اس میں رائے دینے والے کون ہیں

---

(۱) ضرورت کا پورا کرنا ہے (۲) اور ضرورت کو پورا کرنا اپنے آپ کو باقی رکھنے کے لئے ہے (۳) اپنی جان کی حفاظت بھی چند روزہ ہے جب تک زندگی ہے (۴) اولاد تو ذاتی بقاء کے لئے بھی نہیں بلکہ اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لئے مقصود ہوتی ہے (۵) اپنی نوع یعنی انسانوں کے باقی رہنے کی آپ کو کیا فکر۔

کہ خواہ مخواہ آپ کی نوع باقی ہی رہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ آپ ہی کے اولاد ہو۔

لڑکوں کو ذِکر اور لڑکیوں کے عدمِ ذکر میں نکتہ

یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون(۱) کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے بنات(۲) کو بیان نہیں فرمایا اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں(۳) تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت(۴) دنیا ہوں گی۔

دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ بنات زینتِ دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمانا اور بنات کو ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے لئے پھرو اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں۔

پردہ کے وجوب پر عقلی دلیل

یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اُردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں ہیں چھپانے کی چیز، تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو

(۱) لڑکوں کو (۲) لڑکیوں (۳) مصیبت (۴) وہ کیا باعث زیب و زینت ہوں گی۔

پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسے یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول بھی لغو ہے کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔

پردہ تعلیم میں رکاوٹ نہیں

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علمی سے رُکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے، اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کو عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہوسکتا بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہوسکتی ہے کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشۂ تنہائی(۱) میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے معین ہے نہ کہ مانع(۲) نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں۔

عورتوں کو سیر و سیاحت کا نقصان

ہاں علوم تجارت اور علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربہ میں

(۱) تنہائی کی جگہ (۲) پردہ تو حصول علم کے لئے مددگار ہے رکاوٹ نہیں۔

حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اسی لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں مرد تو برسوں میں کسی بہت ہی بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورتوں کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دیکر نئی شادی کرلیا کرتیں۔ بس عورتوں کے لئے یہی سیر وسیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی ان کا حاصل ہوسکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں نظر حقیقت بین(۱) سے دیکھیں تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر وتماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواریوں سے استغناء ہوجائے گا ؎

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر وسمن درا تو زغنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

''تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو''

چوں کوئے دوست ہست بصحراچہ حاجت ست
خلوت گزیدہ رابہ تماشاچہ حاجت ست

''جب محبوب کے دربار میں ہو جنگل کی کیا ضرورت ہے خلوت نشین کو تماشہ کی کیا حاجت ہے''۔

(۱) حقیقت کو دیکھنے والی نظر سے اگر دیکھیں۔

تعلق مع اللہ کا فائدہ

جس کو دولت مل گئی اس کو تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ آنکھوں سے کچھ نظر آتا ہو وہ نابینائی کی حالت میں بھی خوش وخرم رہے گا۔ بینا کو نابینا ہونے کے بعد مطمئن ہم نے کسی کو نہیں دیکھا مگر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے ابھی دیکھا ہے مولانا نابینائی کی حالت میں بھی ایسے مطمئن تھے جیسے بینائی کی حالت میں تھے آخر مولانا میں کیا بات تھی مولانا نبی تو نہ تھے امتی ہی تھے تو جو بات ان کو حاصل تھی وہ آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں یعنی تعلق مع اللہ یہ وہ دولت ہے کہ اس کے بعد کسی سیر و تماشا کی ضرورت نہیں رہتی یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کشف وکرامت کو مولانا کی طرف منسوب کر رہا ہوں کہ مولانا کو نابینائی کی حالت میں بھی ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ بینائی کی حالت میں اس لئے آپ مطمئن تھے۔ ان حضرات کے سامنے کشف و کرامت کی حقیقت ہی کیا ہے نہیں، بلکہ مولانا کے اطمینان کا سبب محض تعلق مع اللہ تھا اُن کو دُنیا سے تعلق ہی نہ تھا اس لئے بینائی کے جاتے رہنے کا بھی کچھ غم نہ تھا بلکہ عجب نہیں کہ اس سے خوش ہوئے ہوں کہ پہلے اغیار پر نظر پڑتی تھی اب محبوب کے سوا کسی پر نظر نہیں۔

اہل اللہ کی سلطنت سے بے رغبتی

افسوس ان حضرات پر نادانوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ شورش برپا کرینگے (۱) اس لئے ان کی سخت نگرانی چاہیئے۔ ہائے شورش یہ کرینگے جن کو دنیا سے کچھ تعلق ہی نہیں شورش تو وہ کرے گا جس کو دنیا مطلوب ہو۔ اور ان حضرات کی تو یہ حالت ہے کہ

(۱) وہ کوئی فساد کھڑا کرینگے۔

بے شورش کے بھی اگر ان کو کوئی ملک ملتا ہو تو اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں شورش کر کے تو ملک وحکومت یہی لیں گے۔ (۱)

حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملک سنجر کے بادشاہ ملک نیمروز کا خط آیا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کو خرچ خانقاہ کے لئے دینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ حضرات طالب حکومت ہوتے تو فوراً منظور کر لیتے مگر آپ نے جواب میں یہ تحریر فرمایا ؎

چوں چتر سنجری رُخِ بختم سیاہ باد دردل اگر ہوس ملک سنجرم

یعنی اگر میرے دل میں تیرے ملک کی ہوس تک بھی ہو تو خدا کرے میرا بخت سیاہ رو ہو جائے (۲) جیسا کہ تیرا چتر سیاہ ہے اُس زمانہ میں سلاطین کا چتر سیاہ ہوا کرتا تھا آگے اس کے بے رغبتی کی وجہ بیان فرماتے ہیں ؎

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب من ملکِ نیمروز بہ یک جو نمی خرم

کہ جب سے مجھے نیم شب یعنی آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے اُس وقت سے ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے بھی نہیں خریدنا چاہتا (اس وقت ایک طرف سے آواز آئی کہ حضرت اِدھر بھی رُخ کیجئے آواز نہیں آتی فرمایا کہ پھر ایک واعظ اور بلالو اِدھر اُدھر والوں کو سنا دیگا ہم کسی کے نوکر نہیں (۳) جو آپ کے گھانے سے گھومتے رہیں جب جی چاہے گا تو اُدھر بھی رُخ کر لیں گے اور اگر کسی کو آواز نہ پہنچتی ہو اور اس لئے بیٹھنا گراں ہو تو وہ اُٹھ کر چلا جائے ۱۲ظ) واللہ جس کو یہ

(۱) ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی طشتری میں رکھ کر بھی ان کو حکومت پیش کرے تو یہ نہ لیں حکومت واقتدار کے حصول کے لئے ان سے کسی فساد کی توقع عبث ہے (۲) میرا مقدر ہی سیاہ ہو جائے (۳) اس وقت حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت کے اثر سے استغناء کا غلبہ زیادہ تھا نیز لہجہ بھی درخواست کا نامناسب تھا غالباً اس لئے ایسا جواب دیا ورنہ حضرت اکثر ایسی درخواست پر توجہ ضرور فرماتے ہیں ۱۲ منہ۔

دولت مل گئی ہو اُس کو سلطنت کی ہوس نہیں رہ سکتی بلکہ وہ اس سے گھبراتا ہے کیونکہ اس سے تعلق مع اللہ میں تشویش اور تشتت پیدا ہوتا ہے(۱)۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی حکومت کا حال

لوگ آج کل حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے قصوں میں بحث میں اوقات ضائع کرتے ہیں مثلاً بعضے کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اول خلیفہ کرنا چاہیئے تھا میں بقسم کہتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دل سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے ان کو مصیبت سے بچالیا کیونکہ حضرات صحابہ کی خلافت شاہانِ اودھ کی سی نہ تھی کہ رات دن عیش اور مستیاں کرتے ہوں وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کی سخت دوپہر میں جبکہ لُو چل رہی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جارہے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیرالمؤمنین ہیں جب اُن کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیرالمؤمنین اس وقت سخت گرمی اور لُو میں کہاں جارہے ہیں؟ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہوگیا ہے اس کی تلاش میں جارہا ہوں، انہوں نے عرض کیا کہ کسی خادم کو نہ بھیج دیا، فرمایا قیامت میں سوال تو مجھ سے ہوتا خادم سے سوال نہ ہوتا، عرض کیا پھر تھوڑی دیر توقف کرکے تشریف لے جائیں ذرا گرمی کم ہوجائے، فرمایا: ((نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا)) ''جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے'' یہ کہہ کر اُسی دھوپ اور لُو میں جنگل تشریف لے گئے یہ سلطنت تھی۔

ایک بار آپ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے خطبہ میں فرمایا: (اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا) ''سنو اور اطاعت کرو'' ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا (لَانَسْمَعُ وَلَا نَطِیْعُ) ''ہم نہ سنیں گے نہ اطاعت کرینگے'' آپ

(۱) پریشانی اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔

نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا کہ آپ نے دو کپڑے پہن رکھے ہیں جو مال غنیمت سے تقسیم ہوئے ہیں مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا آپ نے دو کپڑے کیسے لئے ؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم سچ کہتے ہو، اے عبداللہ! تم اسکا جواب دے دو اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے اور کہا امیر المومنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز پڑھاتے تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریۃً دے دیا ہے اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہوگئے جن میں ایک کی لنگی بنالی اور ایک کی چادرہ، یہ سن کر سائل رونے لگا اور کہا جَزَاكَ اللّٰه (اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دیں) اب آپ خطبہ پڑھیں ہم سنیں گے اور اطاعت کرینگے۔

یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا تو اس صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز نہ تھی جس کی تمنا کی جائے ہرگز نہیں واللہ اس سے زیادہ مصیبت کی چیز کوئی نہ تھی تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوسکتے تھے، کبھی نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حال

دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی تو اس کی تمنا وہ کرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا نعوذ باللہ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دنیادار اور طالب دُنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی یہ خاصیت ہے کہ ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

''جس شخص نے آپ کو پہچان لیا وہ جان و مال واسباب اور بال بچوں کی

کیا پرواہ کریگا‘‘

پھر اُن کو خلافت دیر میں ملی تو کیا، اور نہ ملتی تو کیا، ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہوسکتا تھا بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون؟ یہ تو وہی مثل ہوئی مدعی سست گواہ چست۔ (۱)

نکتہ

اسی دنیا کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ: مال اور بنون زینت حیٰوۃ دنیا ہیں اور ان کو زینت کہنے میں ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ زینت وآرائش اعراض میں سے ہے تو اس میں یہ بتلایا ہے کہ دنیا کے جواہر بھی اعراض ہی ہیں گو بظاہر جواہر نظر آتے ہیں مگر فانی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے وجود میں غیر مستقل مثل اعراض کے ہیں اس کے مقابلہ میں آخرت کے اعراض بھی جواہر ہیں کیونکہ وہ باقیات صالحات ہیں یہ نکات تو اِسوقت ذہن میں ہیں اگر غور کیا جائے تو اور بھی نکات نکل آئیں گے ان کی تو انتہا ہی نہیں۔

اعمال صالحہ کے ذِکر اور اعمال سیئہ کے عدم ذکر کی وجہ

مجھے اس وقت زیادہ تر آیت کے اسی جزو کا بیان مقصود ہے: ﴿ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴾ کیونکہ یہ بیان مدرسہ کے جلسہ میں ہورہا ہے اور مدرسہ باقیات صالحات سے ہے، سو سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی چیزوں سے مراد (اچھے اعمال ہیں) ثواب کے اعتبار سے اور امید

(۱) مدعی تو دعویٰ کرتا نہیں اور گواہ پیچھے پڑا ہوا ہے۔

کے اعتبار سے تمہارے پروردگار کے نزدیک زیادہ بہتر ہیں۔ یہاں حق تعالیٰ نے لفظ اعمال کو مقدر فرمادیا ہے کیونکہ مقصود بقاء کا مدار خیریت بتلانا ہے گو تحقق اس کا مادۂ اعمال ہی میں ہو پس اگر اعمال کا ذکر ہوتا تو باقیات کا مفہوم اس کی صفت واقع ہوکر تابع ہوجاتا تو مقصود مذکور میں صریح نہ ہوتا۔

اور یہاں چند نکات طالبعلمانہ ذہن میں اور ہیں ان کو مختصراً ذکر کرتا ہوں

ایک یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اعمالِ شر کو ذکر نہیں فرمایا حالانکہ وہ بھی باقیات (۱) سے ہیں کیونکہ جس طرح اعمال صالحہ کی جزاء جنت ہے اور وہ باقیات ہے (۲) ایسے ہی اعمال شر کی سزا جہنم ہے اور وہ بھی باقی ہے تو جب یہاں اعمال کی بقاء کا ثابت کرنا مقصود ہے تو ان کو بھی بیان کرنا چاہیئے تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان کا بیان علی الاطلاق نہیں کیونکہ بعض اعمال شر کی جزاء غیر باقی ہے (۳) اور بعض کی گو باقی ہے جیسے کفر وشرک کی مگر چونکہ اس جزاء والوں کی یہ حالت ہے کہ: ﴿لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی﴾ کہ نہ ان کو وہاں موت ہے نہ زندگی ہے تو ایسی حیات جس کے متعلق لَا یَحْیٰی (نہ زندگی ہے) بھی ارشاد ہے اس قابل نہیں کہ اس کو باقیات کے ساتھ موصوف کیا جائے اور ان کے لئے بقاء کو ثابت کیا جائے، کیونکہ وہ بقاء مثل عدم بقاء کے ہے (۴) دوسرے باقیات صالحات جو ہیں ان کی بقاء محض لغوی نہیں بلکہ بنا بر اِیْصَال اِلَی الْبَاقِیْ (باقی کی طرف پہنچنا) کے ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق خیر ہی کو ہے شر کو نہیں بلکہ وہ تو اس سے تعلق کو قطع کرنے والی ہے (۵) اس لئے اعمال صالحہ ہی باقیات کے ساتھ موصوف کرنے کے قابل ہیں۔ پس صالحات کی قید محض توضیح (۶) کے لئے ہے ورنہ صرف لفظ باقیات ہی اعمال صالحہ کے لئے کافی ہے۔

(۱) ہمیشہ رہنے والے ہیں (۲) جنت ہمیشہ رہنے والی ہے (۳) ان کو مطلقاً اس لئے بیان نہیں کیا کہ بعض بُرے اعمال کی سزا غیر باقی ہے (یعنی توبہ سے یا کسی کی سفارش سے معاف ہوجائیگی) (۴) ان کا باقی ہونا ایسا ہی ہے کہ گویا وہ ہیں ہی نہیں (۵) تعلق توڑنے والی ہے (۶) صرف وضاحت کے لئے ہے۔

شبہ کا جواب

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعمال صالحہ کی بقاء بوجہ تعلق بحق کے ہے یہ ایک تفسیر کی بنا پر نص سے بھی مؤید ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (ہر شئے سوائے اس کی ذات کے ہلاک ہونے والی ہے) کی تفسیر ایک تو ذاتہٖ (اسکی ذات) سے کی گئی ہے اور ایک تفسیر مَاكَانَ لِاَجْلِهٖ (وہ شئے کہ اس کے لئے ہو) سے بھی کی گئی ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اعمال صالحہ کیا فناء عالم کے وقت بھی باقی رہیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک کچھ دیر کو فناء ہو جائیں گے مگر چونکہ وہ ساعت قلیلہ ہے(۱) اس لئے عرفاً وہ گویا باقی ہی ہیں کیونکہ عرفاً انقطاع قلیل کا اعتبار نہیں کیا جاتا(۲) مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح سے شام تک چلتا رہا تو اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں پیشاب کرنے کے لئے بیٹھ گیا ہو تو کوئی اس پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ واہ صاحب وہ تو پانچ منٹ بیٹھا بھی تھا اور مثال لیجئے شعلۂ جوالہ سے حرکت کے وقت ایک پورا دائرہ روشن نظر آتا ہے حالانکہ زیادہ حصہ اس کا تاریک ہے(۳) مگر عرفاً اُس تاریکی کا اعتبار نہیں کیا جاتا بعدم الاحساس(۴) اور اگر اس کو خط مستدیر پر نہ گھمایا جائے(۵) بلکہ یمین سے یسار کو اور پھر رجعت قہقری سے حرکت دی جائے تو رجعت کے وقت تو یسار سے یمین کو ضرور ہی تاریکی ہوگی

(۱) تھوڑا وقت ہے (۲) جو چیز تھوڑی سی دیر کے لئے منقطع ہو اس کا اعتبار نہیں ہوگا (۳) آگ کا ایک شعلہ روشن کر کے اسکو گول دائرے کی شکل میں گھمائیں تو آگ کا ایک گول روشن دائرہ نظر آئے گا حالانکہ اس حرکت میں اس دائرے کا زیادہ حصہ تاریک ہوتا ہے (۴) احساس نہ ہونے کی وجہ سے اس تاریک حصہ کا اعتبار نہیں ہوتا (۵) اگر اس کو گول دائرے کی شکل میں نہ گھمائیں بلکہ دائیں سے بائیں کو گھمائیں پھر فوراً بائیں سے دائیں کو گھمائیں تو بائیں سے دائیں کو تاریکی ہوگی کیونکہ دو حرکتوں کے درمیان سکون کا ہونا ضروری ہے لیکن اس آگ کے دائرے کو مسلسل روشن کہتے ہیں کیونکہ یہ سکون جو اندھیرے کا حامل ہے عارضی ہے۔

"لِتَحِلِّ السَّكُوْنِ بَيْنَ الْحَرَكَتَيْنِ "یعنی دو حرکتوں کے درمیان سکون کا ہونا ضروری ہے لیکن عرفاً یہی کہا جاتا ہے کہ یہ روشنی مستمر معلوم ہے کیونکہ سکون محض آنی ہے۔ اُس کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ پس ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ ساعتِ قلیلہ میں فنا ہوجانا اعمالِ صالحہ کے بقاء کو عرفاً مضر نہیں کیونکہ زیادہ حصہ تو بقاء ہی کا ہے اور گو غیر خیر میں بھی ایسا بقاء ہے مگر اوپر ان دونوں میں فرق بیان ہو چکا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب

اب ایک شبہ اور رہا وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہاں اعمال کو باقی فرمایا ہے حالانکہ وہ تو اعراض ہیں وہ کیسے باقی رہ سکتے ہیں: (لَاَنَّ الْعَرَضَ لَا بَقَاءَ لَهٗ بِالذَّاتِ بَلْ تَبَعًا لِلْمَعْرُوْضِ وَالْمَعْرُوْضُ لَيْسَ بِبَاقٍ نِفَاءَةً بِالْمَوْتِ مَثَلاً)"اس لئے کہ عرض کو بالذات بقاء نہیں بلکہ معروض کے تابع ہوکر بقاء ہے اور معروض مثلاً موت سے فانی ہونے کی وجہ سے باقی رہنے والا نہیں ہے" مثلا پھر بقاء تبعاً للمعروض بھی اعراض لازمہ کو ہے نہ کہ غیر لازمہ کو اور اعمال صالحہ ظاہر ہے کہ اعراض لازمہ نہیں بلکہ غیر لازمہ ہیں ان کا بقاء تو تبعاً للمعروض بھی نہیں رہ سکتا مثلاً نماز پڑھ کر جہاں فارغ ہوئے بس عمل ختم ہوا اب اُس کا بقاء نہ اصالتاً ہے نہ تبعاً۔

اس جگہ سب معقولی تھک گئے مگر علامہ جلال الدین دوانی نے "رسالہ زوراء" میں لکھا ہے کہ آخرت میں یہ اعراض جواہر ہوں گے یعنی جو عمل ہم کرتے ہیں وہ یہاں تو عرض ہے مگر عالم آخرت (جو کہ مکاناً اسوقت بھی موجود ہے) جواہر ہوں گے فقط اور اس کے لئے یہ صورت جوہریہ صدور ہی کے وقت سے حاصل ہوجاتی ہے اور وہ صورت جوہریہ باقی رہے گی اب کوئی اشکال نہیں، عارفین تو کشفی طور پر اس کے قائل ہیں ہی مگر ایک معقولی عقلی طور پر بھی اس کا قائل ہے اور عقلاً اس کو جائز و ممکن سمجھتا ہے تقریب

الی الفھم (سمجھ کے قریب کرنے) کے لئے میں طلباء کے واسطے ایک معقولی مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں وہ یہ کہ حصول اشیاء بانفسھا فی الذھن (ذہن میں چیزوں کا حاصل ہونا ان کی حقیقتوں کے ساتھ ہے) بہت سے حکماء کے نزدیک حق ہے اور ظاہر ہے کہ حصول بانفسھا (ان کی حقیقتوں کے حاصل ہونا) سے مراد یہ تو نہیں ہے کہ بعینہ یہی شے جو خارج میں ہے ذہن میں حاصل ہوتی ہے اگر بعینہ حصول ہو تو تصور جبال سے ذہن کا نشقاق (پھٹنا) اور تصور نار سے احراق لازم ہوگا(۱) وغیرہ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت شے کی ذہن میں حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت جوہر کی جوہر ہے حالانکہ صورہ حاصلہ فی الذھن عرض ہے۔ تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے جس طرح اعراض ذہنیہ خارج میں جواہر ہیں اسی طرح اعراض دنیویہ آخرت میں جواہر ہوں تو اشکال کیا ہے۔

اعمالِ صالحہ کی قدر و منزلت

ایک نکتہ اس جگہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحَۃ نہیں فرمایا بلکہ ﴿وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ﴾ فرمایا ہے اس عنوان میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اعمال میں ہر ہر عمل میں مستقل صلاحیت ہے۔ اس لئے صالحہ کا مصداق بھی متعدد ہو کر صالحات صادقہ آوے گا یہ نہیں کہ مجموعہ میں صلاحیت ہوتا کہ ان کو مجموعہ بنا کر صالحۃ صفت مفردہ سے تعبیر کیا جائے یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو بعض اعمال صالحہ کو حقیر سمجھتے ہیں یہ سخت غلطی ہے بلکہ ہر عمل قابل وقعت ہے، حدیث میں آیا ہے کہ ایک بدکار عورت نے ایک کتے کو پیاس کی حالت میں پانی پلایا تھا اس کی اسی عمل پر مغفرت ہوگئی تو اب بتلایئے کیونکر کسی عمل کو حقیر سمجھا جائے نہ معلوم ان کو کونسی بات پسند آجائے ۔

(۱) اگر پہاڑ کا تصور کرے تو اس کی بڑائی کی وجہ سے دماغ کا پھٹنا لازم آئے گا اور آگ کے تصور سے جلنا لازم آئے گا۔

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

''محبوب کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس کی طرف ہوتا ہے''

یہاں سے سالکین کو سبق لینا چاہیئے کیونکہ اہلِ ظاہر تو اپنے اعمال کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو اپنے ہر عمل کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ اس کے گھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے مگر اہل سلوک چونکہ مٹ چکے ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کو بھی ہیچ اور لاشئے سمجھتے ہیں مگر اس میں بعض اوقات تواضع کے ساتھ ناشکری ہوجاتی ہے پس دونوں کے جمع کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عمل کو اس حیثیت سے تو کچھ نہ سمجھو کہ تم نے کیا ہے مگر اس حیثیت سے کہ حق تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے بڑی قدر کرنی چاہیئے خلاصہ یہ کہ یوں سمجھو کہ ہم تو نالائق ہیں مگر حق تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ انہوں نے اپنے کرم سے یہ دولتیں ہم کو عطا فرمادی ہیں اس صورت میں تواضع بھی ہے اور شکر بھی پس اپنے اعمال کو مطلقاً ایسا حقیر نہ سمجھا جائے کہ نعمت حق کی ناشکری ہونے لگے۔

بے جا تواضع سے احتراز

الہ آباد میں ایک ولایتی بزرگ محمد شاہ صاحب تھے حافظ عبدالرحمٰن صاحب بگھروی بیان کرتے تھے کہ میں ایک شخص کے ہمراہ ان کی زیارت کو گیا تو انہوں نے ساتھی سے پوچھا یہ کون ہیں انہوں نے کہا کہ یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں، انہوں نے تواضعاً کہہ دیا کہ جی نہیں میں تو کچھ بھی نہیں بس محمد شاہ انکے سر ہوگئے اور کہا اچھا تم یہ چاہتے ہو کہ حق تعالیٰ تم سے حفظ کی دولت چھین لیں اور تمہارا حج باطل کردیں یہ بڑے چپ ہوئے پھر جب جاتے تو شاہ صاحب کہتے آؤ ناشکرا آؤ ناشکرا۔

صاحبو! اگر یہی تواضع ہے تو نہ معلوم اپنے کو کیا بناؤ گے کیونکہ ہر چیز میں

کچھ نہ کچھ کمال ہے۔ اگر اپنے کو مسلمان کہو گے اس میں بھی کمال ہے آدمی کہو گے اس میں بھی کمال ہے بھنگی چمار کہو گے اس میں بھی کمال ہے کیونکہ آخر تو وہ بھی آدمی ہیں جانوروں سے تو اچھے ہیں دوسرے بھنگی اور چماروں کے پاس ایسا کمال ہے کہ اگر آج وہ اپنا کام چھوڑ دیں تو سارا عالم پریشان ہوجائے اور بڑے بڑے امراء ان کی خوشامد کرنے لگیں۔ ایک عالم تھانہ بھون میں اپنے ایک شاعر شاگرد کو چھیڑتے تھے کہ ہر پیشہ والوں کی دنیا میں ایسی ضرورت ہے کہ اگر وہ نہ رہیں تو لوگ پریشان ہوجائیں حتی کہ بھنگی بھی بجز شاعروں کے کہ یہ کسی کام کے نہیں اگر سب کے سب بھی مرجائیں دنیا میں کسی کام کا بھی کچھ حرج نہ ہو غرض گھٹیا سے گھٹیا پیشہ کی طرف نسبت کرنے میں بھی کچھ کمال ضرور ہوگا اور کچھ نہ سہی آدمی ہونے کا ہی کمال ظاہر ہوگا، ہاں ایک صورت تو تواضع کی ہے کہ اپنے کو آدمی ہی نہ کہو جانور کہنے لگو جیسے آج کل بعض لوگ آدمی سے جانور بنتے ہیں کسی کا لقب طوطی ہند کسی کا بلبل ہند ہے اور مزا یہ کہ اس کو فخر سمجھتے ہیں بھلا اس میں بھی کچھ فخر ہے کہ آدمی طوطی اور بلبل بن گئے کیا یہ جانور آدمی سے افضل ہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں آدمی بنایا مسلمان بنایا نمازی بنایا ذکر کی توفیق دی۔ ان نعمتوں کی قدر کرو اور ایسی تواضع نہ کرو جس سے ان کی ناشکری ہونے لگے۔

کیفیات واحوال کی حقیقت

اور عجیب بات ہے کہ آج کل سالکین اعمال کی تو بے قدری کرتے ہیں ہاں احوال کی قدر کرتے ہیں چوبیس ہزار دفعہ ذکر اللہ کرکے جی خوش نہیں ہوتا ہاں ذرا کشف ہوجائے یا گریہ طاری ہوجائے تو بس جامہ سے باہر ہیں (۱) یہ کیسی

(۱) کسی کا حال معلوم ہوجائے یا رونا آجائے تو آپے سے باہر ہوجائیں گے۔

نادانی کی بات ہے یاد رکھو اصل چیز اعمال ہی ہیں یہی کام آنے والے ہیں احوال کا کیا ہے ہوئے یا نہ ہوئے۔ ہاں اگر اعمال کے ساتھ احوال بھی نصیب ہو جائیں تو نور علیٰ نور ہے ورنہ صرف احوال کا اعتبار نہیں ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر کر رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

''میں اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا ہوں۔ ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں''

احمقانہ حساب

غرض باقیات کے ساتھ صالحات کے لانے میں ہر عمل کی وقعت کا اظہار ہے اور جب اعمال آخرت باقی رہنے والے ہیں تو اس کے مقابلہ میں مال و بنون(۱) کو زینت فرمایا گیا ہے تو اس لفظ سے اس پر تنبیہ ہے کہ دنیا کی چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ اور جب دنیا کے اموال واولاد فانی ہیں تو اگر وہ آپ سے پہلے اور آپ کے سامنے فنا ہو جائیں تو غم نہ کرو کیونکہ وہ تو فنا ہونے والے تھے ہی، پس ایسی فانی چیزوں کے متعلق تمہارا یہ حساب لگانا کہ یہ لڑکا اتنی عمر کا ہوگا اتنی تنخواہ کمائے گا پھر اس کی شادی ہوگی پھر اس کے بال بچے ہوں گے۔ یہ سارا حساب ایسا ہے جیسا دریا کے متعلق ایک بنیئے نے حساب کیا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک لالہ جی گاڑی کرایہ کر کے اپنے کنبہ کو لے کر چلے تھے راستہ میں دریا آیا جو خوب چڑھا ہوا تھا گاڑی بان نے کہا معلوم نہیں کتنا پانی ہے ڈوبنے کا خطرہ ہے، بنیئے نے ایک بانس لے کر ناپا کہ پانی کنارہ پر کتنا ہے اور بیچ میں کتنا اور دوسرے کنارہ کو پہلے پر

(۱) مال اور اولاد۔

قیاس کرلیا سلیٹ پر حساب نکالا اور بیچ کی گہرائی کو دونوں کناروں پر تقسیم کر کے اوسط نکالا کمر تک ہے، اور گاڑی بان سے کہا کہ تم بے فکر ہو کر گاڑی ڈال دو ہم نے اوسط نکال لیا ہے کمر تک ہے، چنانچہ گاڑی ڈلوادی جب بیچ میں پہنچے تو لگے ڈوبنے، اب لالہ جی نے اپنے حساب کو پھر دیکھا تو اوسط پھر وہی نکلا تو آپ کہتے ہیں'' لکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں''

تو جیسے اس احمق نے حساب لگایا تھا کہ جیسے سلیٹ پر پانی کا اوسط نکل آیا ہے ایسے ہی دریا میں بھی اوسط برابر ہوگیا ہوگا ایسا ہی اولاد کے متعلق یہ تمہارا حساب ہے جس کو تم اپنے ذہن میں لگا کر یوں سمجھتے ہو کہ بس ایسا ہی ہوگا حالانکہ وہاں ہوتا وہ ہے جو پہلے سے مقدر ہے تمہارے حساب سے کیا ہوتا ہے۔

مال کے ضائع ہونے پر رنج نہ کرو

اسی طرح اگر مال اور روپے ہلاک ہوجائیں تو غم نہ کرو یوں سمجھ لو کہ یہ تو ہلاک ہونے والے ہی ہیں۔ بعضے مال کے ہلاک ہونے سے غم کرنے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تو ہم کو ثواب ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ خیال ہی خیال ہے ہلاک ہونے کے بعد ہی یہ خیال آتا ہے اگر روپے گھر میں رہتے تو کبھی یہ خیال نہ آتا اور اگر کسی کو واقعی یہ خیال ہو تو میں کہتا ہوں وہ شخص مطمئن رہے اُس کو ثواب مل گیا کیونکہ ثواب کا مدار نیت پر ہے۔ جب تم نے یہ نیت کرلی تھی کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرینگے تو ثواب اسی وقت مل گیا اب چاہے خرچ کی نوبت آئے یا نہ آئے تمہارا ثواب ضائع نہ ہوگا۔ پس اس وجہ سے بھی قلق (۱) نہ ہونا چاہیئے البتہ اعمال صالحہ اگر فوت ہوں اس کا قلق ہونا چاہیئے۔

(۱) رنج نہ ہونا چاہیئے۔

سالکین کو نصیحت

مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام تو جس قدر چاہیں قلق کریں ان کو تو مفید ہے اور سالکین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں بلکہ تھوڑی دیر تک رنج کرلیں پھر جی بھر کے توبہ کرلیں اور اپنے کام میں لگیں اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا، ہائے یہ خطا کیوں ہوئی، ہر وقت اسی کا شغل رکھنا سالک کو مضر ہے کیونکہ یہ فکر ترقی تعلق مع اللہ میں حجاب ہوجاتی ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاط قلب سے اور یہ قلق نشاط کو کم کردیتا ہے(۱) لیکن تھوڑی دیر تک تو قلق کرنا چاہیئے اور خوب رونا دھونا چاہیئے تاکہ نفس کو کوتاہی کی سزا تو ملے پھر توبہ کرکے اور اچھی طرح استغفار کرکے اس سے التفات کو قطع کرلے اور کام میں لگے۔ آج کل زیادہ قلق کرنے میں ایک اور بھی نقصان ہے وہ یہ کہ قلوب اس وقت بے حد ضعیف ہیں زیادہ قلق سے ان کا ضعف بڑھ جاتا ہے جس سے بعض اوقات تعطل (۲) کی نوبت آجاتی ہے جو کھلا ضرر ہے بہرحال جب بعض منافع باقیہ کا فوت بھی زیادہ محل قلق نہیں تو منافع فانیہ یعنی منافع دنیویہ تو بالکل ہی محل قلق نہ ہوں گے تو ان پر تحسر (۳) بالکل ہی بے معنی ہے خصوصاً جبکہ یہ بات ثابت ہے مسلمانوں کی جو چیز بھی ضائع ہوتی ہے سب حق تعالیٰ کے یہاں جمع ہوجاتی ہے جس کا اُسے ثواب ملتا ہے یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی لگتا ہے تو اُس سے بھی ثواب ملتا ہے۔

---

(۱) تعلق مع اللہ بڑھتا ہے جبکہ دل خوش ہو اور یہ رنج دل کی خوشی کو کم کردیتا ہے (۲) جس سے اعمال چھوٹ جاتے ہیں (۳) حسرت وغم بالکل نہ ہونا چاہیئے۔

تفسیر آیت

اس جگہ اسی اصل پر ایک آیت کی تفسیر سمجھ لو بڑے کام کی بات ہے وہ یہ کہ ایک جگہ حق تعالیٰ نے دنیا کی مثال میں فرمایا ہے: ﴿مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾(۱) حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار حیاتِ دنیا میں جو خرچ کرتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کافر کی کھیتی پر پالہ پڑجاتے اور اس کو تباہ کردے تو جیسے وہ کھیتی ہری بھری ہونے کے بعد بالکل ضائع ہوجاتی ہے یوں ہی کفار کا خرچ کیا ہوا مال بوجہ عدم ایمان کے ضائع محض ہوتا ہے، یہ تو آیت کا حاصل تھا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس مثال میں: ﴿حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ﴾ ''کسی کافر قوم کی کھیتی پر'' کیوں فرمایا حالانکہ پالہ تو کافر کی کھیتی کو بھی تباہ کرتا ہے اور مسلمان کی کھیتی کو بھی۔

تو بات یہ ہے کہ مسلمان کی کھیتی کا پالہ سے کامل طور پر نقصان نہیں ہوتا گو کھیتی برباد ہوجائے مگر اس مصیبت سے اجر صبر بڑھ جائے گا اور آخرت میں جو ثواب اس کے بدلہ میں ملے گا وہ اس کھیتی سے لاکھ درجہ افضل ہوگا کیونکہ اجر آخرت کی تو شان یہ ہے ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

''فانی جان لیتے ہیں جان باقی عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان بھی نہیں آئیگا وہ عطا کریں گے''

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل می خری گلزار را

''ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک گل کے بدلے میں یہ تمام چمن خریدلو''

---

(۱) آل عمران: ۱۱۷۔

پس ضیاع اعمال کافر کے لئے کافر ہی کی کھیتی مثال ہوسکتی ہے کہ پالہ سے فنائے کامل اُسی کو ہوتا ہے کیونکہ اس کا بدل بھی نہیں ملتا مسلمان کو کامل اور حقیقی نقصان نہیں ہوتا اس لئے: ﴿ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ﴾ ''جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا (یعنی کافر) قید بڑھائی واللہ یہ بڑے مزے کی قید ہے۔

مسلمانوں کے لئے خوشخبری

اور مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے کسی نقصان سے بھی اُن کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے مسلمان کے لئے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی۔ غیر قومیں بھی تو کہا کرتی ہیں کہ مسلمان بڑھے تو امیر گھٹے، تو فقیر جنکی امیروں سے بھی زیادہ قدر ہے اور مر گئے تو پیر، اور دوسری قومیں بڑھیں تو سپوت اور گھٹیں تو کپوت اور مریں تو بھوت کہ زندوں کو لپٹتے پھرتے ہیں، مسلمان کو مراد حاصل ہوجائے تب تو خوشی ہی ہے اگر نامراد بھی رہے تب بھی خوشی ہے کیونکہ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست بے مرادی نے مراد دلبرست

''اگر چہ تمہاری مراد میں مزا شکر کا ہے، کیا بے مرادی محبوب کی مراد نہیں ہے''

اگر مراد میں مزا ہے تو بے مرادی میں ثواب ہے کیونکہ وہ حضرت حق کی مراد کے موافق ہے عشاق کے لئے تو یہی بات خوش ہونے کو کافی ہے گو ثواب بھی نہ ہوتا مگر اب تو ثواب بھی ہے، عشاق کو تو اسی سے خوشی ہوتی ہے کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے، بس یہ سوچ کر بڑی سے بڑی مصیبت بھی خوشگوار ہوجاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر خضر علیہ السلام کی صحابہ کو تسلی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کیا مصیبت ہوگی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر بھی حضرت خضر علیہ السلام نے صحابہ کو اس طرح تسلی فرمائی تھی: ((اِنَّ فِی اللّٰہ جَزَاء مِنْ کُلِّ مُصِیْبَۃٍ وَخَلَفًا مِنْ کُلِّ فَائِتٍ فَبِاللّٰہ فَتَّقُوْا وَاِیَّاہُ فَارْجُوْا فَاِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حَرَمَ الثَّوَابَ)) ''یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہر مصیبت سے تسلی ہے اور ہر فوت ہونے والے کا عوض ہے پس اللہ پر بھروسہ رکھو اور اس سے امید رکھو کیونکہ پورا محروم تو وہی ہے جو ثواب سے بھی محروم رہے'' اور مسلمان کسی صورت میں ثواب سے محروم نہیں رہتا جب اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بدل ہے تو اور کیا رہ گیا۔ اب کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہوں۔ ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیئے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا کیونکہ نقصان دین کی تلافی بھی توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری سے ہوسکتی ہے۔

رجاء (امید) کا فائدہ

اب میں آیت کا ترجمہ پھر کرتا ہوں اور چند باتیں اس کے متعلق بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا﴾ کہ باقیات صالحات خدا کے پاس ثواب اور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں یعنی اعمال صالحہ سے ثواب کے ساتھ بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اُمید بھی قائم ہوجاتی ہے کہ ان شاء اللہ وہ ہم سے راضی ہیں اور یہ امید بڑی چیز ہے اس کی قدر عشاق سے پوچھنی چاہیئے عشاق تو اسی امید کے بھروسہ جیتے ہیں کسی

نے خوب کہا ہے ؎

اگر چہ دور اُفتادم بدین امید خُرسندم کہ شاید دست من بارِدگر جاناں من گیرد

''اگر چہ میں دور پڑا ہوں اس امید میں خوش ہوں کہ کبھی تو میرا ہاتھ دوبارہ میرا محبوب پکڑے گا''

اور یہ امید ہوسنا کی (۱) کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ رجاء ہے جس سے روح تازہ اور زندہ ہوتی ہے (۲) جیسے ایک عاشق کا قصہ ہے کہ نزع کے (۳) وقت اسے محبوب کے آنے کی خبر ملی تو فرط شوق میں اُٹھ بیٹھا پھر معلوم ہوا کہ وہ دروازہ تک آ کر لوٹ گیا یہ سنتے ہی گر پڑا تو یہ رجاء وہ چیز ہے جس سے مرتے مرتے کو بھی ایک دفعہ حیات جدیدہ (۴) حاصل ہوجاتی ہے مگر اس عاشق کا محبوب تو مجازی تھا اس لئے اس کی رجاء ادھوری (۵) رہی اور جن کو حق تعالیٰ سے رجاء ہو جو (لَمْ یَزَلْ وَلَا یَزَالُ) ''ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے'' اور رحیم و کریم و عاشق نواز ہیں اُن کا کیا پوچھنا، واللہ ان کے لئے تو اس رجاء کی بدولت ہر دم تازہ حیات ہے (۶)۔

اعمالِ صالحہ کا نقد فائدہ

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ میں نفع نقد بھی ہے صرف اُدھار ہی نہیں ہاں ایک چیز اُدھار بھی ہے یعنی ثواب اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد ہے وہ یہی رجاء اور امید ہے جو بدون اعمال صالحہ (۷) کے حاصل نہیں ہوتی اگر کسی مجرم

---

(۱) فضول خواہشات کا نام نہیں ہے (۲) بلکہ یہ اپنے پروردگار سے ایک امید قوی ہے جس سے روح تازہ ہوتی ہے (۳) جب کہ وہ زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا تھا اور مرنے کے قریب تھا (۴) نئی زندگی (۵) اس کی امید ناقص رہی (۶) ہر لحہ ایک نئی زندگی ہے (۷) بغیر اعمال صالحہ کے۔

کو امیدوار دیکھا جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ امید وار نہیں ہے بلکہ ہوسناک اور مبتلائے غلطی ہے اور اگر سچ مچ امیدوار ہی ہو تو یقیناً اس کے پاس کوئی عمل صالح ہے جس کی بناء پر اس کو یہ رجاء حاصل ہے چاہے اور کچھ نہ ہو ایمان اور اسلام ہی ہو کیونکہ ایمان اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الصّالِحَہ (نیک اعمال میں سب سے افضل) ہے باقی کسی کافر کو ہرگز خدا سے صحیح امید نہیں ہوسکتی اس کو تو محض ہوس اور غرور ہی ہوگا۔ غرض اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ نقد ہے۔

بُرے اعمال کا فوری نقصان

اور اسی طرح اعمال سئیہ کا بھی ایک ثمرہ اُدھار ہے اور ایک نقد، اُدھار تو عذاب جہنم ہے اور نقد وہ وحشت اور ظلمت (بُرے کام) اور بے چینی ہے جو گناہوں کے لئے لازم ہے اسی واسطے بعض لوگوں نے تو کہہ دیا کہ جنت اور دوزخ ہر شخص کو اس وقت محیط ہیں جس کے پاس اعمال صالحہ ہیں، اس کو اسی وقت جنت محیط ہے کیونکہ رجاء کی وجہ سے اس کو بہت بڑی راحت حاصل ہے اور جس کے پاس اعمال سئیہ ہیں اُس کو اُسی وقت دوزخ محیط ہے کیونکہ گناہوں کی وحشت اور ظلمت سے دنیا میں بے چینی اور عذاب ہے۔

نماز کی لذت

میں نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے خود سنا ہے کہ بھائی جنت کا مزہ برحق حوض کوثر کا مزہ برحق مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں اور سجدہ میں جاتے ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیار کرلیا۔ سبحان اللہ! جس شخص کو اعمال کی یہ لذت نصیب ہو اس کے لئے دُنیا ہی میں جنت کیوں نہ ہوگی۔

ہر نقد ادھار سے بہتر نہیں

یہاں سے ان لوگوں کا جواب بھی ہوگیا جو کہا کرتے ہیں کہ آخرت دنیا سے افضل تو ہے مگر وہ اُدھار ہے اور یہ نقد ہے اور طبعاً انسان نقد کا عاشق ہے اس لئے اضطراراً دنیا کو ترجیح دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں اول تو یہی غلط ہے کہ نقد کو ہر حال میں ترجیح دیجاتی ہے بھلا اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ اگر اس وقت مکان لینا چاہو تو یہ کچا گھر ملے گا اور اگر سال بھر کے بعد لو تو بڑا عالیشان پختہ محل ملے گا بتلایئے اس وقت آپ کس کو ترجیح دینگے یقیناً سال بھر کے انتظار کو گوارا کرینگے۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ آخرت اُدھار ہے واللہ اعمال آخرت کا ثمرہ نقد بھی ملتا ہے اور جن کو اس ثمرہ کا پتہ چل گیا ہے وہ ہفت اقلیم کی سلطنت (۱) پر بھی نگاہ نہیں اُٹھاتے وہ ثمرہ یہی خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور ان سے اُمید کا وابستہ ہوجانا، اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطین دنیا کو اس دولت کی خبر ہوجائے جو ہمارے پاس ہے تو وہ تلواریں لے کر ہمارے اوپر چڑھ آئیں اور اس دولت کو چھیننے کا ارادہ کریں۔

اعمالِ صالحہ کا نقد فائدہ راہِ ہدایت پر ہوتا ہے

حق تعالیٰ نے ایک مقام اعمال صالحہ کے دو ثمرے بیان فرمائے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۲) کہ ''یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں'' یعنی اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی دوسرا ثمرہ عاجلہ ہدایت (۳) بھی ہے یہاں ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ ہدایت کا ثمرہ ہونا کیسا، ثمرہ تو وہ ہے جس میں حظ

(۱) ساری دنیا کی حکومت بھی اگر ان کو دی جائے تو (۲) سورۃ بقرہ: ۵ (۳) دوسرا فائدہ نقد بھی ہے۔

ہو(۱) اور ہدایت تو خود عملی حالت ہے اس میں کیا حظ ہوتا، مگر ایک حکایت سے آپ کو اس کا ثمرہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور وہ خود مجھے پیش آیا۔ میں ایک دفعہ سہانپور سے کانپور جارہا تھا تو سہارنپور سے لکھنؤ جانے والی ریل میں سوار ہوا۔ اُسی گاڑی میں میرے ایک دوست اور ہم وطن مگر جنٹلمین بھی پہلے سے سوار تھے میں یہ سمجھا تھا کہ شائد یہ لکھنؤ جارہے ہوں گے کیونکہ ایک زمانہ میں اُن کے تعلقات لکھنؤ میں بہت رہ چکے تھے سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بیک بینی و دوگوش تھے(۲) نہ ساتھ میں کمبل نہ رضائی، کیونکہ آج کل جنٹلمینوں کے سفر کا اُصول یہی ہے کہ سفر میں اسباب(۳) ساتھ نہیں لیتے۔ جب ریل چھوٹ گئی تو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے؟ کہنے لگے میں میرٹھ جارہا ہوں، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جارہے ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں یہ گاڑی لکھنؤ جارہی ہے۔ میں نے انہیں کے محاورہ میں گفتگو کی اب تو وہ بڑے چونکے کہنے لگے کیا یہ گاڑی لکھنؤ جارہی ہے؟ میں نے کہا ہاں، پھر تو ان کی یہ حالت تھی کہ بار بار لاحول پڑھتے ہیں اور اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں میں نے کہا ہاں میاں اب تو رُڑکی سے اس طرف یہ گاڑی ٹھہرتی نہیں(۴) پریشان ہونے سے کیا حاصل اطمینان سے بیٹھو اور باتیں کرو تو جھلا کر کہتے ہیں کہ تم کو باتوں کی سوجھی ہے اور مجھے پریشانی ہورہی ہے اس وقت میں نے اپنی اور ان کی حالت میں غور کیا کہ حالانکہ میں ابھی تک منزل پر نہیں پہنچا اور یہ ابھی اپنے مقصود سے بہت دور نہیں ہوئے بلکہ لوٹتی گاڑی(۵) میں یہ اپنی منزل مقصود پر مجھ سے پہلے پہنچ جائیں گے مگر پھر بھی میں مطمئن ہوں اور یہ غیر مطمئن، تو آخر میرے اطمینان اور ان کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے تو یہی معلوم ہوا کہ

(۱) لذت ہو (۲) ایک ناک اور دو کانوں کے ساتھ محاورہ ہے یعنی بغیر ساز و سامان کے سفر کررہے تھے (۳) سامان (۴) رُڑکی ایک جگہ کا نام ہے اس پہلے گاڑی رکے گی نہیں (۵) بلکہ واپس آنے والی ٹرین سے۔

میرے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ میں راہ پر تھا اور ان کی بے اطمینانی کا سبب یہ تھا کہ وہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ریل جس قدر مسافت طے کرتی تھی مجھے مسرت وراحت بڑھتی تھی اور ان کو ہر ہر قدم خار تھا(۱)۔

تو اس واقعہ سے آیت کی تفسیر واضح ہوئی کہ: ﴿أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ''یہ لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی جانب سے'' بھی ایک بڑا ثمرہ ہے اور ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ یہ ثمرہ دنیا میں ہر مسلمان کو حاصل ہے کافر کو یہ بات نصیب نہیں۔

باقیات صالحات کی دو قسمیں

مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ باقیات صالحات بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا ہے پھر اس بقاء میں بھی تفصیل ہے کہ بعض اعمال تو مطلقاً باقیات ہیں اور بعض کو ابقی (زیادہ باقی رہنے والا) کہنا چاہیئے جیسے مدرسہ اور خانقاہ کہ یہ صدقات جاریہ ہیں۔ یعنی بعض اعمال کی تو یہ حالت ہے کہ زندگی کے بعد ان کا ثواب نہیں بڑھتا بس جتنا ثواب زندگی میں کما چکے ہو وہی باقی رہے گا اب اس میں ترقی نہ ہوگی اور صدقات جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی برابر بڑھتا رہتا ہے تم قبر میں پڑے سو رہے ہو گے اور اس وقت بھی فرشتے نامۂ اعمال میں ثواب لکھتے ہوں گے تو مدرسہ اور خانقاہ کی بناء ایسے ہی اعمال ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے مگر آج کل خانقاہ بنانے والوں کو چاہیئے کہ خانقاہ کے نام سے نہ بنائیں بلکہ مدرسہ ہی کے نام سے بنائیں اور اس میں کام کریں خانقاہ کا، کیونکہ ایک تو خانقاہ کے نام سے شہرت زیادہ ہوتی

(۱) ان کی ہر لحہ پریشانی بڑھتی تھی۔

ہے دوسرے بعد میں خانقاہ کے اندر بدعات ہونے لگتی ہیں کوئی عرس کرتا ہے کوئی قوالی کرتا ہے پھر گدی نشینی کا قصہ ہوتا ہے جس میں بہت جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ خانقاہ کا نام نہ کیا جائے بلکہ مدرسہ بناؤ اور اس میں تربیت اخلاق اور تعلیم سلوک کا کام کرو کہ وہی حقیقی مدرسہ بھی ہوگا اور وہی خانقاہ بھی ہوگی۔ پس حقیقی مدرسہ وہ ہے جس میں علم کے ساتھ عمل کی بھی تعلیم اور نگہداشت ہو۔

اہلِ مدارس کو نصیحت

پس اے مدرسہ والو! تم اپنے مدرسوں کی سنبھال اور انکو حقیقی مدرسہ بناؤ یعنی طلباء کے اعمال کی بھی نگہداشت کرو ورنہ یاد رکھو ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) ''تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں باز پرس کی جائے گی'' کے قاعدہ پر آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا کیونکہ آپ طلباء کے نگہبان ہیں اور وہ آپ کی رعایات ہیں پس یہ جائز نہیں کہ آپ طلباء کو سبق پڑھا کر الگ ہو جائیں بلکہ یہ بھی دیکھتے رہو کہ ان میں سے کون علم پر عمل کرتا ہے اور کون عمل نہیں کرتا جس کو عمل کا اہتمام ہو اسے پڑھاؤ ورنہ مدرسہ سے نکال باہر کرو جب تو آپ کا مدرسہ واقعی دارالعلوم ہوگا ورنہ وہ دارعلم بلغت فارسی ہوگا(۱) کہ اس میں علم کو سولی دی گئی ہے طلباء کہ تمام افعال نگہداشت کرو لباس کی بھی دیکھ بھال رکھو جو لوگ کوٹ پتلون بوٹ وغیرہ پہنتے ہوں ان کو لباس اہل علم کی ہدایت کرو ورنہ مدرسہ سے الگ کرو چاہے مشابہت تامہ ہو یا مشابہت ناقصہ سب کا انتظام کرو اور ان سے صاف کہہ دو ؎

(۱) فارسی میں ''دار'' سولی کو کہتے ہیں تو گویا اس وقت وہ علم کا گھر نہیں ہوگا بلکہ علم کو سولی پر چڑھانا ہوگا یعنی علم کو پھانسی دیدی گئی۔

یا مکن باپیلباناں دوستی یا بناکن خانہ بر انداز پیل

''یا تو پیل بانوں(۱) سے دوستی مت کرو یا گھر ہاتھی کے انداز پر بناؤ''

کہ اگر علم حاصل کرنا ہے تو طالب علموں کی صورت بناؤ ورنہ رخصت، یہ تو علماء سے خطاب تھا۔

عوام کو نصیحت

اب عوام کو خطاب کرتا ہوں کہ آپ مدرسہ کی خدمت کریں مدرسہ کے جس کام میں بھی آپ امداد کریں گے یہ تمام باقیات صالحات ہوں گے بعض لوگ صرف تعلیم کی امداد کو صدقہ جاریہ سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ مدرسہ کی تعمیر اور طلباء کے کھانے پینے اور کپڑے کی امداد سب صدقات جاریہ ہیں کیونکہ سب سے تعلیم ہی کو امداد پہنچتی ہے پھر جب یہ لوگ پڑھ کر فارغ ہونگے اور مخلوق کو جا کر تعلیم دینگے تو ہمیشہ آپ کو اس کا ثواب ملتا رہیگا جب تک اس مدرسہ کے طلباء سے علم کا فیض چلے گا برابر آپ کے نامۂ اعمال میں ثواب درج ہوتا رہے گا، تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ مدرسہ کی امداد تو آپ نے کی پچاس برس تک یا کسی کی بہت عمر ہوئی تو سو برس تک اور نامۂ اعمال میں ثواب لکھا گیا ہزار برس تک بلکہ قرب قیامت تک کیونکہ ان شاء اللہ قرب قیامت تک علم کا چرچا دنیا میں رہے گا اور اگر اپنی زندگی میں آپ نے ان کاموں میں امداد نہ کی تو روپیہ تو صَرف ہو ہی جائیگا وہ تو باقی نہ رہیگا مگر فضول یا ناجائز مواقع میں صَرف ہوگا یا بعد میں ورثاء گلچھرے(۲) اڑائینگے اور ان گناہوں کے آثار آپ کے نامۂ اعمال میں باقی رہینگے۔

ایک بے وقوف کی حکایت سے استدلال

جیسے ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ روز بستر پر پیشاب کرلیا کرتا تھا اس کی

(۱) ہاتھی والوں سے (۲) ورثاء فضول خرچیوں میں ضائع کرینگے۔

بیوی نے ملامت کی کہ کیا خرافات ہے (۱) کہ تم اتنے بڑے ہو کر بستر پر موتتے ہو (۲) میں روز بستر کو دھوتے دھوتے تھک گئی ہوں۔ کہنے لگا کیا بتلاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ آؤ تمہیں سیر کرالاؤں پھر کہیں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہوجاتی ہے تو میں خواب کے اندر قدمچہ پر (۳) بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں وہ بستر پر نکل جاتا ہے، بیوی کہنے لگی کہ جب شیطان تمہارا اتنا بڑا دوست ہے تو آج اُس سے یہ کہنا کہ تیری دوستی کس کام آئیگی ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے ہم کو بہت سا روپیہ دلوادے، مرد نے کہا بہت اچھا آج ضرور کہوں گا، چنانچہ رات ہوئی اور شیطان آیا تو آپ نے بیوی کا پیغام پہنچایا شیطان نے کہا تمہارے واسطے روپے بہت، ایک خزانہ میں اس کو لے گیا اور اس کی کمر پر اتنے روپے لادے کہ میاں کا پاخانہ نکل گیا صبح کو جو آنکھ کھلی تو بستر پر پاخانہ موجود اور روپے غائب، بیوی نے کہا یہ کیا، آپ نے سارا قصہ سنایا وہ کہنے لگی بس جی میں ایسے روپوں سے باز آئی تم روز پیشاب ہی کرلیا کرو ہگامت کرو (۴)۔

تو اسی طرح گناہ کے کاموں میں روپیہ صَرف کرنے کا یہ انجام ہوگا کہ روپیہ تو غائب ہوجائے گا اور نامۂ اعمال میں اس کے گناہ باقی رہیں گے پھر جہنم کا عذاب الگ رہا اس لئے ضرورت ہے کہ اعمال صالحہ کا اہتمام کرو اور اپنی کمائی کو اچھے موقع پر صَرف کرو اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرو۔ اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کی اطاعت میں کوشش کرو۔

اب میں ختم کرتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مدرسہ کی جو کچھ کارروائی اس وقت ہوگی اس کو دیکھ کر جائیں بیان کے بعد منتشر نہ ہوں۔

(۱) کیا بدتمیزی ہے (۲) بستر پر پیشاب کرتے ہو (۳) راستہ میں کھڈی یعنی ڈبلیوسی وغیرہ جس پر بیٹھ کر پیشاب وغیرہ کرتے ہیں اس پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں (۴) پاخانہ مت کیا کرو۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

(منبر سے اُترتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس بیان کا نام ''مظاہر الآمال''(۱) رکھ دیا جائے (۲)۱۲ظ)

وَ صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّد وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

(۱) امیدوں کا اظہار (۲) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں اور محشی کے لئے اس کو باقیات صالحات میں شمار فرمائیں۔

خلیل احمد تھانوی

۴/محرم الحرام ۱۴۳۲ھ۔ ۱۱/ دسمبر ۲۰۱۰